غالب کا رومان

ایک دلچسپ رومانی داستان

غالب کے رومان

ڈاکٹر عارف بٹالوی
ایچ۔ پی۔ یو۔ ایم۔ ڈی۔ (سکالر)
آر۔ ایم۔ پی۔ ایچ۔ ایس۔ ایم

قیمت :- سات روپے

مطبوعہ :- محبوب المطابع برقی پریس، دہلی ۶

ناشر :- شاہین بک سٹال۔ مائسمہ بازار
سری نگر (کشمیر)

رنگ و بُو

ایک فنکار کی زندگی اس کے فنی کمالات کی تہوں میں چھپ کر رہ جاتی ہے۔ اس کے پرستار اس کے معتقد اس کے مداح اور اس کے پجاری اس اس کے انسانی کردار کو عقیدت کے حریری پردوں میں چھپا لیتے ہیں اس طرح اس کے انسانی کردار کو نمایاں کرنے کی بہت کم جرأت کی جاتی ہے۔ مرزا غالب کی زندگی کے بارے میں بھی یہی کیفیت نمایاں نظر آتی ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ مرزا غالب ایک بے مثال شاعر ایک بے نظیر ادیب اور ایک عظیم فنکار گزرے ہیں۔ لیکن وہ سب سے پہلے ایک انسان ہیں اور انسان کی حیثیت سے وہ اپنا انفرادی کردار بھی رکھتے ہیں۔ ان کے اس انفرادی کردار کو کسی سے کیوں چھپایا جائے۔ جب کہ مرزا کی شاعرانہ رفعت ادیبانہ عظمت اور فنکارانہ حشمت میں یہی کردار کارفرما نظر آتا ہے۔

ہو سکتا تھا۔ اگر ان کے لئے سامانِ عیش و عشرت قائم رہتے تو وہ عظمتِ علم و فن سے محروم رہتے۔ یہ حقیقت بھی تسلیم کرنا پڑے گی کہ مرزا کو آلامِ روزگار نے

بہت سے انسانی حقائق سے روشناس کرایا۔ جس کے باعث ان کی شاعری ان کے لئے شہرت عام اور بقائے دوام کا پیام بنی۔ مرزا نے اس حقیقت کو خود تسلیم کیا ہے ؎

رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے ہم
بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

جہاں تک مرزا غالبؔ کی شاعرانہ عظمت و اہمیت کا تعلق ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ جب تک نظامِ کائنات جاری و ساری ہے۔ دنیا ہر دور میں غالبؔ کو پہچانتی رہے گی۔

عارف بٹالوی
لاہور

اعتراف

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کی سوانح حیات قلم بند فرمانے کا حق صرف مرزا صاحب کے مخصوص احباب کو حاصل تھا۔ ہم تو کہی سنی بات کو دہرانے والوں میں سے ہیں۔ مرزا صاحب کے مخصوص دوست نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سید الطاف حسین حالیؔ۔ میر کرم حسین۔ مرزا احمد بیگ تپاںؔ۔ ابوالقاسم قاسمؔ۔ نواب اکبر علی خاں طباطبائی مولوی سراج الدین احمد خاں۔ نواب احمد بخش خاں اور پھر آپ کے بیٹے شمس الدین خاں۔ امین الدین خاں۔ اور ضیاء الدین خاں۔ مرزا صاحب کے مربی و دوست مفتی صدر الدین (شہر کے مجسٹریٹ) مولانا فضل حق خیر آبادی مومن خاں مومنؔ۔ امام بخش صہبائی۔ منشی ہر گوپال تفتہ۔ اور حضرت مجروحؔ تھے۔ اس حلقہ احباب میں سے تین بزرگ اس قابل تھے کہ قید حیات و بند غم پر قلم اٹھاتے ایک جناب شیفتہ دوسرے حضرت حالیؔ اور پھر قبلہ مجروحؔ۔

شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالیؔ نے مرزا غالبؔ کی سوانح حیات ضابطہ تحریر میں لاکر قیامت تک آنے والے زمانہ علم و ادب پر احسانِ عظیم فرمایا

سے ہے۔ مولانا حالی کی یہ تصنیف یادگار غالب ایسی جامع و مکمل ہے کہ اب جو شخص بھی مرزا غالب کی سوانح عمری لکھے گا اسے لامحالہ اسی چراغ سے اپنا چراغ روشن کرنا پڑیگا اس کے سوا کوئی دوسرا چارہ کار ہی نہیں ہے۔ اس لئے یادگارِ غالب کے ہوتے ہوئے مرزا غالب کے حالاتِ زندگی پر کسی دوسری تصنیف و تالیف کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی اس قسم کے اضافے سے ادب کو کسی قسم کا فروغ حاصل ہوتا ہے۔ لیکن مرزا غالب کی شخصیت اس نوعیت کی ہے کہ ہر صاحبِ قلم کا جی چاہتا ہے کہ اپنی معلومات کے مطابق اپنے مخصوص رنگ میں مرزا کی زندگی کے کسی نہ کسی گوشے کو اپنے عروجِ فکر کے تلے بانے سے بن کر ایک انوکھا پیراہن پہنائے۔

کسی کے ملنے یا نہ ملنے سے کسی کے اعتراف کرنے یا نہ کرنے سے مرزا غالب کی فنی اور ادبی عظمتوں میں کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔ یہ لازوال عظمتیں اپنے عروج کی آپ دلیل ہیں۔ سو برس پہلے جو کتابیں وہ آج پرانی ہو چکی ہیں۔ ان میں کچھ ایسی ہیں۔ جن کا وجود تک ختم ہو چکا ہے۔ اور کچھ ایسی بھی ہیں جنہیں کچھ رد و بدل کے بعد نیا رنگ و روپ دیا گیا ہے۔ لیکن مرزا غالب کی نثر و نظم سو برس کے بعد بھی محتاجِ تشریح ہے۔ ہر دور کا ادیب کلام غالب کو سمجھنے کی کوشش میں سرگرداں نظر آتا ہے۔ ہر شارح نے اپنی سمجھ کے مطابق شرح کی اور ایک دعوت یارانِ نکتہ داں کے لئے دیکر خاموش ہو گیا۔ ہر ادیب نے اپنی عقل و بصیرت کے مطابق خیالاتِ غالب پر تبصرہ کیا۔ اور آنے والے دور کے لئے فکر و دانش کی ایک نئی راہ پیدا کر گیا۔ گویا نظم و نثر غالب سو سال کے بعد بھی اہل علم کے لئے ایک معمہ ہے۔ ہر نکتہ ایک نیا نکتہ پیدا کرتا ہے۔ اور اس کی خرد ادبی گتھیاں سلجھانے میں مصروف

رہتی ہے۔ ہر غالب بیں غالب کو اپنے طور پر سمجھ کر فتحمندوں کا جشن مناتا ہے ان صد سالہ مسلسل سعی و کاوش سے ظاہر ہوا کہ سو برس کے بعد بھی کوئی حتمی طور پر اعلان نہیں کر سکتا کہ جو کچھ میں نے غالب کو سمجھا ہے وہ حرفِ آخر ہے بلکہ ہر غالب نگار نے اپنی تحریر و تقریر کو کوشش ناتمام کہہ کر اپنی حدِ ادراک کی بے بسی کا اعتراف کیا ہے۔

میرا بھی جی چاہتا ہے کہ میں بھی مرزا غالب کی زندگی کے ان گوشوں کو اُجاگر کروں جن میں عیش و طرب کے چراغ فروزاں رہے ہیں۔ کیونکہ حیاتِ غالب کے یہی گوشے نشاط و مستی سے پُر کیف و سرشار نظر آتے ہیں۔ انہی گوشوں میں زندگی کی رمق ملتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تاریخ غالب کے کچھ اوراق ایسے بھی ہیں جنہیں نظر انداز کرنا حیاتِ غالب پر ستم کرنے کے مترادف ہے۔ کیونکہ

بنتی نہیں ہے ساغر و مینا کہے بغیر

اجدادِ غالبؔ

۱۷۴۵ء کا زمانہ تھا کہ ترکستان میں سلجوقی خاندان کے اقتدار کا پرچم لہرا رہا تھا۔ تورانی النسل ایبک، قوم نے اسلامی عہد میں عالی شان سلطنت قائم کی اس قوم کے افراد تاجدارانِ ذی اقتدار تھے۔ ان میں الپ ارسلان ملک شاہ اور شاہ سنجر اعلیٰ وقار کی عظمت و عزت کے مالک رہ چکے تھے۔ لیکن کیانی سلطنت کے عروج و اقبال نے سلجوقی اقتدار کی دھجیاں اڑا دیں۔ ملک میں ایبک خاندان کے لئے امن و سلامتی کے دروازے بند ہو گئے۔ اس خاندان پر ظلم و ستم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ کیانی وقار نے ان کی عظمتوں کے جھنڈے اکھاڑ پھینکے اب انہیں وطن عزیز میں رہنا دشوار ہو گیا۔ اس خاندان کے افراد کا قتل عام شروع ہو گیا۔ کیانی سلطنت کی بنیاد تورانی خاندان کے افراد کی لاشوں پر اٹھائی گئی۔ سلجوقی سلطنت کے زوال کے ساتھ تورانی النسل لوگ غربت نصیب ہو کر پریشان حال کہیں سے کہیں چلے گئے۔ ان میں سے ایک شہزادہ ترسم خاں تھا۔ اس وقت اس کی عمر بائیس تئیس برس کے قریب ہوگی۔ ترسم خاں

چند لوگوں کو لیکر ترکستان سے ہجرت کر گیا اور سمرقند میں جا بسا۔ یہاں تھوڑی دیر قیام کر کے ہندوستان کا رُخ کیا۔ اس وقت ہندوستان میں محمد شاہ بادشاہ کا دورِ حکومت تھا۔ ترسم خاں پہلے لاہور میں ٹھہرے اور نواب امین الملک کے دربار میں مصاحبِ خاص بن کر عزت حاصل کی۔ نواب امین الملک نے اس خانماں برباد شاہی قافلے کا بڑی عزت سے استقبال کیا اور ایک خاندان کے افراد کو باوقار عہدے دیکر ان کی رہائش و قیام کا بندوبست کیا۔ لیکن جلد ہی نواب صاحب انتقال کر گئے اور نواب صاحب کے انتقال کے بعد پنجاب میں بدامنی پھیل گئی۔ چنانچہ ترسم خاں کو بھی لاہور چھوڑنا پڑا اور وہ دہلی چلے گئے۔ دہلی میں شاہ عالم بادشاہ کی تخت نشینی کے بعد مرزا نجف خاں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہوئے۔ مرزا نجف خاں نے مرزا ترسم بیگ خاں کو اس کے شاہی وقار کا لحاظ رکھتے ہوئے معقول عہدہ دیا۔ پہاسو کی جاگیر ذاتی مصارف اور رسالے کے اخراجات کے لئے عنایت ہوئی۔ پچاس سواروں کا رسالہ اور نوبت و نشان ان کے شایانِ شان مقرر ہوا اور اس طرح وہ دہلی میں سکونت پذیر ہو گئے۔

۱۷۷۰ء میں مرزا ترسم خاں کے ہاں لڑکا پیدا ہوا جس کا نام عبداللہ بیگ رکھا گیا۔ اس وقت مرزا ترسم کی عمر تیس برس سے اوپر ہو چکی تھی اور وہ ایک باوقار رسالدار کی حیثیت سے زندگی گزار رہے تھے۔ دو برس کے بعد ۱۷۷۲ء میں مرزا ترسم خاں کے ہاں دوسرا صاحبزادہ پیدا ہوا اس کا نام نصراللہ بیگ رکھا گیا۔

جب مرزا عبداللہ بیگ خاں جوان ہوئے تو لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ کے دربار میں مصاحب ہوئے یہاں سے وہ حیدرآباد دکن چلے گئے۔ اور

نواب نظام علی خاں کے ملازم ہو گئے۔ حیدر آباد دکن میں ان کے لیے تین سو سواروں کا رسالہ اور حسبِ مرتبہ ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ کچھ وقت اس ملازمت پر کام کیا۔ لیکن دل نہ لگا اور سبکدوش ہو کر اکبر آباد (آگرہ) چلے آئے۔

جنوری ۱۷۹۵ء میں آگرہ کے ایک خاندانی رئیس خواجہ غلام حسین خاندان کمیدان سے راہ و رسم پیدا ہو گئی۔ خواجہ صاحب نے ان کے اعلیٰ حسب نسب اور ذاتی شرافت سے متاثر ہو کر اپنی صاحبزادی عزت النساء بیگم کی شادی ان سے کر دی۔ شادی کے فوراً بعد مرزا عبداللہ بیگ نے ریاست الور کا رُخ کیا تاکہ وہاں معقول ملازمت مل سکے۔ مرزا عبداللہ بیگ خاں والیِ ریاست راجہ بختاور سنگھ سے ملے راجہ نے انہیں اپنا ملازم رکھ لیا۔

۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء میں آگرہ میں مرزا عبداللہ بیگ کے ہاں لڑکا پیدا ہوا نانا خواجہ غلام حسین نے اس بچے کا نام اسداللہ بیگ خاں رکھا بچے کی پیدائش پر بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ ۱۸۰۲ء میں ریاست الور کے خلاف ایک سرکش زمیندار نے بغاوت اختیار کی۔ راجہ بختاور سنگھ نے مرزا عبداللہ بیگ کو اس کی سرکوبی کے لیے بھیجا اور کہا کہ اگر آپ کامیاب واپس آ گئے تو عزت و مرتبہ میں نمایاں اضافہ کر دیا جائے گا۔ مرزا عبداللہ بیگ فوج لیکر روانہ ہو گئے اور راج گڑھ کے مقام پر کیمپ لگا لیا۔ سرکش زمیندار سے مقابلہ ہوا مرزا خود صفِ اول میں جا کر لڑے اور کمال دلیری سے مقابلہ کرتے رہے۔ لیکن دشمن کی ایک گولی دل کو چیر گئی اور وہ میدانِ جنگ میں ہی وفات پا گئے۔ راجہ کی فوج نے راجہ گڑھ ہی میں انہیں سپردِ خاک کر دیا۔ اس وقت مرزا اسداللہ خاں کی

عمر پانچ برس کی تھی۔

مرزا عبداللہ بیگ خاں کی تین اولادیں تھیں۔ سب سے بڑی لڑکی جو دسمبر ۱۷۹۵ء میں پیدا ہوئی چھوٹی خانم تھی۔ اس سے چھوٹے مرزا اسد اللہ خاں تھے اور سب سے چھوٹے مرزا یوسف بیگ خاں تھے جو دسمبر ۱۷۹۹ء میں پیدا ہوئے۔

مرزا عبداللہ بیگ خاں کی وفات کے بعد ان یتیم بچوں کی تمام تر ذمہ داری ان کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ خاں نے اپنے ذمہ لے لی۔ وہ اس وقت ایک معزز صوبیدار اور صاحب ثروت تھے۔ ان کے اپنی کوئی اولاد نہ تھی۔ مرزا نصر اللہ بیگ خاں مرہٹوں کی طرف سے آگرہ میں صوبیدار تھے۔ لیکن انگریزوں نے مرہٹوں پر یلغار کر کے ان کے بیشتر علاقے اپنے قبضے میں کر لئے۔ آگرہ بھی انگریزی تسلط میں چلا گیا اس وجہ سے مرزا نصر اللہ بیگ خاں کی ملازمت بھی ختم ہو گئی۔ انگریزی عملداری میں صوبیداری کمشنری بن گئی اور ایک انگریز آگرہ کا کمشنر مقرر ہوا۔ مرزا نصر اللہ بیگ خاں فخر الدولہ اعتماد الملک، نواب احمد بخش خاں رستم جنگ رئیس فیروزپور جھرکہ و جاگیردار لوہارو کی ہمشیرہ سے بیاہے ہوئے تھے نواب صاحب کو انگریزوں میں بڑا اثر و رسوخ حاصل تھا۔ چنانچہ نواب صاحب نے لارڈ لیک بہادر سے سفارش کر کے مرزا نصر اللہ بیگ خاں کو انگریزی فوج میں رسالدار مقرر کر دیا۔ مرزا نصر اللہ بیگ کے لئے آگرہ کے دو پرگنے سونگھ اور بولنا ان کی جاگیر میں دیدیئے گئے۔ اسطرح ان کی پرانی امارت اور عزت و عظمت برقرار رہی۔ ان کی آمدنی ایک ہزار روپیہ ماہانہ ذاتی خرچ کے علاوہ تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپیہ

سالانہ تھی۔ ۱۸۰۶ء میں اچانک خبر آئی کہ نصراللہ بیگ ہاتھی سے گر کر انتقال کر گئے ہیں۔ خاندان میں ایک کہرام مچ گیا۔ اب مرزا اسداللہ خاں کے سر پر کسی بزرگ کا سایہ نہ تھا۔ ان کی والدہ انہیں بہت چاہتی تھیں۔ باپ کی جائیداد و چچا کی وراثت اور نانا حضور کی عطا کی ہوئی جاگیر سب کی سب اس خاندان کے قبضہ میں تھی۔ آگرہ میں کئی مکان بازار اور دکانیں ان کی جائداد میں شامل تھیں۔ نہایت معقول آمدنی تھی شاہانہ طور کے ٹھاٹھ تھے۔ مرزا اسداللہ خاں کو عیش و آرام اور تفریح کے سوا کوئی کام ہی نہ تھا۔ اور ۱۸۰۷ء میں شعر و شاعری کا آغاز ہوا۔ ابتدا میں اسد تخلص کیا۔

مرزا کے بچپن کے دوستوں میں دو ہم عمر دوست تھے۔ یہ بھی پرانے رئیس زادے تھے۔

جامِ شراب

مرزا غالب کے ہم نشینوں میں ایک بلوان سنگھ بھی تھے یہ بھی رئیس زادے تھے اور عمر میں دو چار سال بڑے تھے۔ اس دور میں ہندو مسلمان کی کوئی فرقہ وارانہ تفریق نہ تھی۔ بلکہ پیار و محبت کے رشتے قائم تھے۔ بنسی دھر اور بلوان کے تعلقات بزرگوں سے چلے آرہے تھے۔ بنسی دھر مرزا کے ہم عمر تھے۔ ان کا اکثر وقت مرزا کے ہاں ہی گزرتا تھا۔ مرزا عیش و عشرت میں وقت گذار رہے تھے۔ ہمجولیوں کی ٹولی کی ٹولی ان کے ساتھ تھی۔ شہزادوں کے سے ٹھاٹھ تھے۔ شاہی دستر خوان تھا۔ اور امیرانہ بزم آرائیاں۔ مرزا کشمیری کٹرہ میں بڑی حویلی میں رہا کرتے تھے اور شطرنج اور چوسر اور گنجفہ کے کھیل جمے رہتے تھے۔ حویلی کی چھت پر پتنگ بازی کا شغل جاری رہتا۔ بلوان سنگھ کی حویلی ذرا ہٹ کر تھی وہ بھی پتنگ کے شوقین تھے مرزا اور بلوان کے درمیان خوب خوب پتنگ لڑا کرتے۔

بلوان سنگھ مزاج کے انوکھے تھے۔ اس کے ہاں رقص و سرور کے

جلسوں کے علاوہ جام و ساغر کے دور بھی چلتے تھے۔ بزمِ عیش و طرب میں عشق و عاشقی کے کھیل بھی کھیلے جاتے تھے۔ لیکن مرزا اور بنسی دھر اس شغل سے پاک تھے۔ بلکہ انہیں ان مشغلوں سے نفرت تھی اور وہ گاہے گاہے بلدان کو روک ٹوک کرتے رہتے تھے۔ بلدان کو اگرچہ ان کی روک ٹوک گوارا نہ تھی لیکن وہ دوستی کے لحاظ سے چپ رہتا۔ دل میں کہتا کہ ایک نہ ایک روز تمہیں بھی اس راہ پر لاکر چھوڑوں گا۔

عزت النساء بیگم نے اپنے لاڈلے مرزا نوشہ کو تعلیم کی طرف متوجہ کیا اور آگرہ کے ایک عالم فاضل بزرگ شیخ معظم کی خدمت میں بٹھا دیا۔ مرزا اسد اللہ خاں بڑے ذہین تھے مروجہ علوم میں کمسنی ہی میں خاصی دست گاہ حاصل کرلی اور سنِ شعور کو پہنچنے سے پہلے ہی اردو زبان میں شعر گوئی کی طرف توجہ کرنے لگے اور فارسی زبان میں نثر نگاری کی طرف مائل ہوئے اس عہد میں مرزا اسد تخلص کرتے تھے۔

۱۸۰۹ء میں ادبی محفلوں میں جانا شروع کیا۔ مشاعروں میں شرکت کا ذوق بڑھا۔ غزلیں کہتے اور مشاعروں میں سناتے ہم عمر دوست خوب داد دیتے اور جھوم جھوم کر ان کے شعر پڑھتے۔

مرزا اسد لڑکپن میں مردانہ حسن و جمال کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ متناسب الاعضا، کشادہ پیشانی۔ بھرے بھرے رخسار۔ کھلتا ہوا رنگ۔ بڑی بڑی بادام جیسی آنکھیں۔ لانبی پلکیں۔ چوڑا چکلا سینہ۔ بھرا بھرا بدن۔ مسی مالیدہ دانت۔ اس پر خوش پوشاک۔ غرض ایسے جوان رعنا ہیں کہ جس طرف سے

نکل جاتے ہیں۔ لوگوں کے پہلو سے دل نکل جاتے ہیں۔ جس محفل میں شرکت کرتے ہیں ایک منفرد حیثیت نظر آتی ہے۔ نظر باز منتظر رہتے ہیں کہ نیاز حاصل ہو جائیں شہر میں ان کے حسن و جمال کا خوب خوب چرچا ہے۔ دس گیارہ برس کی الڑ عمر شہزادگی کا عالم۔ عیش و عشرت کا ماحول۔ فضا خوشگوار امنگوں پر نکھار۔

ایک روز مرزا اور بنسی دھر بڑی حویلی میں سرِ شام شطرنج کھیلنے بیٹھ گئے۔ مرزا نے بازی جیت لی۔ بنسی دھر نے چوسر کھول کر بچھا دی مرزا کب اُٹھنے والے تھے۔ جم کر بیٹھ گئے۔ یہ بازی بنسی دھر نے جیت لی۔ مرزا نے فوراً ہی گنجفہ بچھا دیا۔ بنسی دھر بھی جم گئے ہنسی خوشی کی باتیں ہوتی رہیں۔ دونوں کھلاڑی ایسے سمجھدار تھے کہ کھیل ختم نہ ہو رہا تھا۔ مرزا کے گھریلو ملازموں میں کلوان کی بہت دیکھ بھال رکھتا تھا۔ کھانے کا وقت گزرا جا رہا تھا۔ وہ زنانخانہ سے اٹھکر مردانہ میں آیا۔ دیکھا کہ مرزا جی اور بنسی دھر گنجفہ میں مشغول ہیں۔ کلو کو جرات نہ تھی کہ مرزا جی کو کھیلتے ہوئے بلالے۔ چپکے سے زنانخانہ میں واپس چلا گیا۔ اور کھانا اٹھا کر لے آیا اور خاموشی سے مرزا جی کے قریب رکھدیا۔ بنسی دھر کو بھوک ستا رہی تھی۔ کھانا دیکھ کر نہ رہ سکا۔ بولا۔ گنجفہ ہم کہیں سے کرایے پر نہیں لائے ہیں۔ چھوڑیئے مرزا جی اٹھئے پہلے کھانا کھالیں۔ مرزا نوشہ نے مسکراتے ہوئے کھیل سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اور اٹھ کر چاندنی پر جا بیٹھے۔ دونوں دوست کھانا کھاتے رہے اور باتیں بھی کرتے رہے۔ باتوں باتوں میں بلوان کا ذکر چلا تو بنسی دھر نے کہا

بنسی دھر۔ مرزا جی!! اس بلوان کا کچھ علاج ضرور کیا جائے۔

مرزا: کیا کریں بنسی یار۔ وہ کمبخت ایسی راہ پر چل نکلا ہے کہ اس کی باتیں سُن کر دکھ ہوتا ہے۔ ہم نے ہزار بار کہا ہے کہ ہماری محفل میں بیٹھا کرو۔ اس بازار میں آنا جانا چھوڑ دو۔ ہمارے یار ہو تو ہمارے ساتھ رہا کرو وقت گذارنے کے لئے ہمارے مشاغل کم نہیں ہیں۔ مگر وہ ہماری سُنتا کب ہے اُلٹا ہمیں اپنا ہم مشرب بنانے کی فکر میں ہے۔

خان: کیا فرمایا مرزا صاحب: وہ بدچلن ہمیں اپنا ہم مشرب بنانے کی فکر میں ہے۔؟

مرزا: جی ہاں۔ ایک روز کہنے لگا یار تم کو کیا خبر یہ بادہ گلفام کیا شے ہے ایک بار پی لو یہ سب مشغلے بھول جاؤ گے۔

میر: لعنت کمبخت پر۔

بنسی: یہی نہیں عشق و عاشقی بھی فرماتے ہیں۔ ہمارے یار۔ اور وہ بھی ایک کوٹھے دار چھنال سے۔

مرزا: ہم تو خدا لگتی کہیں گے۔ وہ گیا ہے اپنے بزرگوں پر۔ لیکن پھر بھی یار ہے۔ یار کو بُری راہ پر دیکھ کر ہمیں رنج ضرور ہوتا ہے۔

بنسی: خیر جی ہمیں کیا۔ جو بوئے گا وہ کاٹے گا۔

میر: خدا لگتی تو یہی ہے۔

خان: اچھا جی وہ پتنگ بازی کا جلسہ کب ہے؟

مرزا: بس چھ روز درمیان میں ہیں جمعہ کا دن مقرر ہے۔

بنسی: بلوان نے تو پلٹ کر خبر ہی نہیں لی۔

مرزا: خبر کی بھی خوب کہی کوئی ہم بیمار رہیں یا وہ تیمار دار ہے؟
(اس پر ایک قہقہہ گونج اٹھا)

جمعرات کا روز تھا مرزا اپنے مخصوص دوستوں کے ساتھ بڑی حویلی میں بیٹھے چوسر کھیل رہے تھے کہ بلوان سنگھ بھی آگئے مرزا اٹھ کر تپاک سے ملے۔ پھر اپنے قریب بٹھا لیا۔ مرزا نے بھویں سکیڑ کر کہا۔ یار تمہارے سانس سے رام ذنگی کی بو آرہی ہے۔ بنسی دھر نے ہنس کر کہا۔ اور کیا اس کے منہ سے آموں کی خوشبو آئے گی۔ بلوان کو اس کا چسکا ہے اور وہ اس کے رسیا ہیں مرزا نے کہا۔ بلوان بھیا رقص و سرور اور عیش و نشاط تو رئیسانہ وضعداری کے شایانِ شان ایک مشغلہ ضرور ہے۔ لیکن شراب نوشی اور بازاری عورتوں سے عشق بازی شریف لوگوں کا شیوہ نہیں ہے۔ ہم تاسف ہیں تمہارے مخلص ہیں چونکہ تمہارے ساتھ ہمارا دوستانہ ہے اور جب ہم کسی سے تمہارے خلاف یہ باتیں سنتے ہیں۔ تو جی جلتا ہے۔

میر: بس بہت ہو لیا۔ بلوان بھائی۔ یاروں کی شریفانہ وضع پر آجاؤ اور ان خرافات سے درگذرو۔

خان: اچھا بتاؤ تم اس وقت کہاں سے آرہے ہو۔ تمہارے گھر کلو کو بھیجا تھا معلوم ہوا کہ تم دو گھنٹے سے غائب ہو۔

بلوان: یاروں سے کچھ چھپایا نہیں جاتا۔ میں واقعی اپنی داشتہ جلو لیف کے مکان سے آرہا ہوں۔ کیا کروں دل لگا بیٹھا ہوں رہا شراب کا معاملہ اس لال پری کے بغیر رہ نہیں سکتا۔ یہ میرا شغل ہے۔ چونکہ تم لوگ اس کے

لطف سے ناآشنا اور محروم ہو۔ اس لئے اس کو بُرا کہتے ہیں۔ اس کا مزہ چکھو تو معلوم ہو۔

بنسی: لیجئے مرزا صاحب اور نصیحت کر لیجئے اپنے یار کو وہ آپ کو اپنا ہم مشرب بنانے کی فکر میں ہے۔

خان: اچھا بھئی یہ دل لگی تو ہوئی۔ بلوان جی کو بتا دو کہ کل جمعہ ہے اور پتنگ بازی کا جلسہ ہے۔

بلوان: جی میں اسی سلسلے میں آیا ہوں۔ مگر یار لوگوں نے بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یار لوگ تہیہ کئے بیٹھے تھے۔

مرزا: بھئی کل جلسہ کس انداز سے ہوگا۔ اس کی وضاحت تو فرما دیجئے۔

بلوان: کل کا مقابلہ عام شرط سے جدا ہوگا۔ اس کی بازی خاص ہوگی۔

مرزا: ہم نے وضاحت طلب کی ہے۔ اور وہ ابھی تک تشنہ ہے آپ جو شرط کہیں منظور ہوگی کیا پانچ سو روپیہ بیچ یا اس سے زیادہ؟

بلوان: نہیں مرزا جی نقدی کی بازی تو آج تک ہمارے درمیان ہوئی نہیں ہے۔ پھر یہ نئی طرح کیوں ڈالیں۔

بنسی: آپ کھل کر بات کیوں نہیں کرتے فرمائیے شرط کیا ہوگی۔

بلوان: پہلے مرزا جی سے اقرار لے لیں مان جائیں تو کہوں۔

مرزا: کیا اقرار نامہ تحریری لوگے؟ یا کسی وثیقہ نویس کو بلا لیا جائے۔ کہہ تو دیا جو شرط کہیں گے منظور ہوگی۔

بلوان: تو پھر دوستوں میں اعلان کر دیجئے کہ ہر شرط منظور ہوگی۔

مرزا: کیا بچوں کی سی ضد کر رہے ہو۔ ہم کبھی دوستوں کی رائے سے باہر ہوئے ہیں۔ ہم تو رانی تلوار کی دھار پر بھی اقرار سے انکار نہیں کرتے۔

بلوان: شرط یہ ہے کہ کل جس فریق کے پیچ زیادہ ہوں اُسے فاتح اور جس کے کم ہوں اُسے ہارا ہوا مان لیا جائے۔

بنسی: بھئی خوب۔ گھڑی بھر سے کس وسوسے میں ڈال رکھا تھا۔ ہم نے سمجھا کوئی نئی بات ہوگی۔ ارے بھئی یہ تو ہوتا آیا ہے۔

بلوان: لالہ جی مہاراج۔ میری پوری بات تو سُن لیں۔ جواب تک ہوتا آیا ہے وہ کل نہیں ہوگا۔ کل کی بازی میں فتحمند فریق کو حق حاصل ہوگا کہ اپنے ہارے ہوئے فریق سے جس انداز، جس پیمانہ کی دعوت کا جس مقام پر بھی چاہے اہتمام کرائے اب کہئے منظور ہے ؟

مرزا: اگرچہ بات پیچ کی ہے۔ لیکن ہم بات میں بات نہیں کھائیں گے۔

مہر: آہا ہا۔ کیا فقرہ چست فرمایا ہے۔ اللہ قسم مزا آگیا۔ بات پیچ کی ہے۔ سبحان اللہ۔

مرزا صاحب اسے توشہ اعلٰی نہ سمجھیں یہ آپ ہی کا حصہ ہے۔

بلوان نے قہقہہ لگایا اور کہا

بلوان: کیا فرمایا ہے واللہ۔ مرزا جی یہ حقیقت ہے کہ ہم لوگ آپ کے تخیل کی گہرائی کو چھو بھی نہیں سکتے۔ ہمیں آپ کی قرابت کا شرف حاصل ہے۔ دوستی کی عظمت نصیب ہے۔ صبح و شام آپ کی صحبت میں

بیٹھنا ہمیں حاصل ہے۔ لیکن رہے بھٹیارے کے بھٹیارے نہ یہ زبان آئی نہ
زبان کے رمز و کنایہ سمجھنے کا ذہن ملا۔
خان: ارے بھئی کچھ بھی ہے کیا یہ کم ہے کہ مرزا جی کے یار تو ہیں۔
میر: اور یار بھی لنگوٹیا۔
مرزا: بلوان جی۔ سنا ہے آپ کو مچھیا طوائف بہت پسند ہے۔
بلوان: تو مرزا جی نے ایک اور چوٹ کی۔ وہ بھی کوئی گانے والی ہے۔ ذرا
ناک نقشہ درست ہے لیکن اسے خوش جمال نہیں کہہ سکتے ویسے
خاصی ہے۔
جنی: ہائے دل ہی تو ہے۔
میر: اجی دل لگی میں صورت شکل کون کمبخت دیکھتا ہے۔
مرزا: بھئی مجرا سننا ہو تو ہمارے ہاں آجایا کرو۔ اس ٹکے کی رنڈی
کے زینے سے اٹک کر کیوں رہ گئے ہو۔ ہمارے نزدیک تو یہ بڑا
گھٹیا پن ہے۔ بلوان بھائی تمہارا ہمارا آبائی واسطہ ہے اس واسطے
سے ہم تم سے واسطہ رکھتے ہیں۔ ہمارا کہا بُرا مانا ہو تو بخشد یجئے۔
بلوان: کبھی یاروں کی بات بھی بُری مانی جاتی ہے۔ اچھا مرزا جی اجازت
دیں۔

بلوان سنگھ دوستوں سے رخصت ہو کر چلا گیا دوسرے دوست بھی بعد
ازاں اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ یہ ڈر چار دوست مرزا کے بہت ہی قریب
ہو چکے تھے۔

مرزا نوشہ یوں تو بچپن ہی سے ناز و نعم میں پرورش پا کر عیش و فراغت کی زندگی بسر کرتے آئے تھے اور ہوش سنبھالتے ہی آزاد منش بھی ہوتے گئے۔ ان کی محفلوں میں رقص و سرور کی رنگینیاں بھی شامل تھیں لیکن طوائف پرستی یا مے نوشی انکا اور بلوان کے علاوہ ان کے دوستوں کا شیوہ نہ تھی اگرچہ اس کے علاوہ دوسرے تفریحی مشاغل میں جی کھول کر حصّہ لینے اور دادِ عیش دیتے تھے۔ بزم نشاط میں شرکت ان کے عہد کے شرفا اور روساء کا شعار تھا۔ رئیسوں۔ امیروں اور شہزادوں کے دیوان خانہ اور بارہ دری یا باغیچہ میں ناچ مجرے معیوب نہیں سمجھے جاتے تھے۔ بلکہ یہ چیزیں امیرانہ مشاغل میں شامل تھیں ابھی تک مرزا کی رنگ رلیاں حدِ تجاوز سے آگے نہ بڑھی تھیں۔

جمعہ کا دن مرزا اور بلوان کے ہاں بڑے اہتمام کے ساتھ طلوع ہوا۔ بلوان اسی رات اپنی چہیتی رقاصہ خورشید کے پاس گیا تھا اور اس سے ساز باز کے منصوبے باندھکر آیا۔ خورشید نے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے ساتھ الھڑ رقاصہ رام کلی کو ضرور لائے گی۔ ان دنوں رام کلی کے حسن و جمال کے آگے کسی کا چراغ نہ جلتا تھا۔ ادھر بلوان اپنی چھت پر منتظر آ رہا تھا اور اس کے ساتھ اس کے ہمجولی تھے۔ ادھر مرزا جی کشمیری کٹرہ کی چھت پر اپنے مخصوص دوستوں کے ساتھ صبح سویرے ہی آن موجود ہو گئے تھے۔ ڈور پتنگ کے بڑے بڑے صندوق رکھے ہوئے تھے اور نیچے انواع و اقسام کے کھانے تیار ہو رہے تھے۔ رنگ برنگ کے پتنگ اڑنے لگے۔ طرفین اپنے اپنے

کمالات دکھا رہے تھے۔ کبھی مرزا جی بازی لے جاتے ہیں کبھی بلوان پیچ کاٹ دیتا ہے اور ایک شور برپا ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ سلسلہ دن بھر جاری رہا۔ اور پیچ پر پیچ لڑتے رہے۔ تماشائیوں اور ڈور پتنگ لوٹنے والوں کا گلی کوچوں۔ سڑکوں اور چھتوں پر ایک ہجوم تھا سارے آگرہ میں اس مقابلہ کی دھوم تھی۔

ایک بار مرزا جی کا پتنگ خان کے ہاتھ میں تھا اور بنسی دھر ڈور سنبھالے ہوئے تھے۔ بلوان سے پیچ لڑا ہوا تھا۔ خان نے گھبرا کر کھینچ شروع کی۔ میر نے للکارا۔ ارے کیا کر رہے ہو یہ کیا اناڑی پن ہے"
بنسی نے کہا۔ ڈھیل دو۔ خان نے جلدی سے ہاتھ روک لیا۔ اور ڈھیل چلائی۔ دونوں طرف سے ڈھیل چلتی رہی۔ یہاں تک کہ دونوں کے پتنگ۔ تارے بن کر ڈوبنے لگے اب مرزا صاحب نے خان سے کہا کہ ذرا دو چار ٹھمکیاں دے دیکھو مخالف کا ارادہ معلوم ہو جائے گا۔ خان نے اس پر عمل کیا۔ اتنے میں بلوان کا پتنگ چکرانے لگا۔ مرزا جی نے کہا۔ اب تیزی سے ایک جھٹکا دو۔ مہاراج سنبھالا لے رہے ہیں فنا ہو جائیں گے۔ خان نے ایک ہی جھٹکا دیا تھا کہ بلوان کا پتنگ کٹ گیا۔ فضا میں شور اٹھا۔

۔ وہ کاٹا ۔

آخر یہ مقابلہ دن ڈھلے ختم ہوا۔ حساب کیا گیا تو بلوان دو پیچ سے جیت گیا۔ مرزا صاحب نے حساب تسلیم کر لیا اور مرزا جی نے بلند آواز سے کہا۔ بلوان جی مبارک ہو آپ جیتے ہم ہارے۔

اس شام سب دوست مل کر بیٹھے۔ بلوان فتحیاب ہوگیا۔ اس نے تجویز پیش کی کہ دعوت صرف طعام ہی کی نہیں ہوگی۔ بادہ وجام کی بھی ہوگی۔ مرزا جی جانتے تھے کہ بلوان مے نوش ہے۔ مرزا جی نے اس کی بات مان لی۔ اور کہا۔ جس قسم کی چاہو اور جس قدر چاہو منگوالو۔ روپیہ ہم دیتے ہیں۔ بلوان نے کہا۔ لیکن یہ دعوت نہ میرے مکان پر نہ آپ کے مکان پر ہوگی بلکہ خورشید جان کے گھر ہوگی۔

یہ سنکر مرزا اور اس کے ساتھی دوست بہت گھبرائے۔ خان نے کہا۔ لیجئے مرزا صاحب آپ کو اپنی نصیحت کا جواب مل رہا ہے۔ اور بلوان کو یار سمجھکر نصیحت کیجئے۔ مرزا نے کہا۔ تیر کمان سے نکل چکا ہے ہم قول دے چکے ہیں۔ مات نہیں کھائیں گے اور بلوان جی کے ساتھ جہنم تک بھی جائیں گے۔

بنسی نے کہا۔ بلوان نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ دراصل یہ ہم سب کو اپنی داشتہ کے کوٹھے پر لے جانا چاہتا ہے۔ اور مے نوشی کی محفل میں شریک بنانا چاہتا ہے۔ مرزا جی نے کہا۔ بھئی ہم قول کے پکے ہیں۔ زبان دے چکے ہیں۔ اب تو بلوان کی شرط تسلیم کرنا پڑے گی۔ تاہم اس میں ہم ذرا سی ترمیم چاہیں گے اور بلوان جی کو ہماری بات تسلیم کرنا پڑے گی۔ خورشید کے گھر کی جگہ تاج محل یا اس کے آس پاس یا بارہ دری میں دعوت کا اہتمام ہو جائے۔ چاہو تو اپنی داشتہ کو وہاں بلالو۔ ان کا مجرا بھی کرالو۔ مگر کسی طوائف کے زینے

تک ہمارے قدم نہ لے جاؤ۔ ذرا سی ضد کے لئے ہماری آن یوں خاک میں نہ مِلاؤ۔ بلوان نے مرزاجی کی بات مان لی اور دعوت کے لئے اتوار کا دن مقرر ہوا۔

ہفتہ کی رات تاج محل والے سامنے باغ میں مخملی شامیانے لگائے گئے اور زمین پر چاندنی اور قالینوں کے فرش بچھائے گئے اور ان پر قیمتی ریشمی دسترخوان بچھا دیئے گئے گاؤ تکئے قرینے سے لگا دیئے گئے۔ اعلےٰ قسم کے کھانوں کا اہتمام شروع ہوا۔ اور اسی گہما گہمی میں شب بسر ہو گئی۔

اتوار کی صبح دوست احباب جمع ہو گئے مرزا نوشہ سج دھج نوشہ بنے ہوئے۔ شہزادگی کے اعلیٰ مرصع لباس میں میر مجلس تھے۔ دوست حُسنِ انتظام کی تعریفیں کر رہے تھے۔ بلوان اپنی داشتہ خورشید جہان اور بُلبلِ آگرہ رام کلی کو ساتھ لایا تھا۔ پینے پلانے والوں کی محفل شامیانے کے اندر ایک گوشے میں تھی۔ مرزا صاحب نظر باز تھے بار بار رام کلی پر نظر ڈال رہے تھے۔ رام کلی سولہ برس کی الڑ دوشیزہ حسین و جمیل اور بادہ شباب سے بھرپور تھی۔ رام کلی کو قدرت نے زیبائی و رعنائی کے ساتھ شعلہ ساز آواز بھی عطا فرمائی تھی۔ اس زمانے میں رام کلی سے بڑھکر نہ تو حسن و جمال میں کوئی کوٹھے دار عورت تھی اور نہ ہی گانے میں کوئی دوسری اس کے ہم پلہ تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ تعلیم یافتہ تھی۔ ابھی اس کی مسی کی رسم تک نہ ہوئی تھی۔ آگرہ کے امیر رئیس اس پر دل و جان سے فدا

تھے اور دولت لٹا رہے تھے. اور عیش و کامرانی کی آس لگائے بیٹھے تھے۔

بلوان نے خورشید کے ذریعہ رام کلی کو ایک خاص سازش کے ماتحت اُسے بھاری رقم دیکر ایک شب کے لئے بُلایا تھا۔ وہ سازش یہ تھی کہ کسی نہ کسی طور مرزا کی پارسائی کا دامن تر کر دیا جائے۔ تاکہ اس ناصح مشفق کا غرور ٹوٹ جائے اور کل کو کسی بزم میں بلوان پر انگشت نمائی نہ کر سکے۔ رام کلی نے پاؤں میں گھنگھرو باندھے۔ عشوہ و انداز کے تیر ترکش شباب میں سجا لئے اور ساقی گری کی رسم ادا کرنے کے لئے اُٹھی۔ جھومتی۔ لچکتی مرزا صاحب کے سامنے پہنچی اور بلوری صراحی اور جام گُل رنگ لیکر ہاتھ بڑھائے۔ مرزا نے مسکراکر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہاتھ روک لیا۔ رام کلی کی مرزا سے پہلی ملاقات تھی۔ جب اول آنکھیں چار ہوئیں۔ تو وہ غریب سر محفل لُٹ گئی۔ بے دام بک گئی۔ محبت کے سوداگر نے سامانِ حُسن و جمال خرید لیا۔ رام کلی لچکتی، بل کھاتی دوسرے مہمانوں کے سامنے چلی گئی۔ مرزا زخمی ہو چکے تھے۔ لیکن اپنی آن بان پر حرف آنا گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے یوں بیٹھے رہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

جام و ساغر ہاتھ سے رکھ کر رام کلی نے سازندوں کو اشارہ کیا اور خود مرزا کی تازہ غزل شروع کی حالانکہ یہ غزل ابھی کسی مشاعرہ میں نہیں پڑھی گئی تھی لیکن بلوان میر صاحب کی وساطت سے مرزا کی یہ تازہ غزل لے اُڑے تھے اور رام کلی کو یاد کرا دی تھی۔

غزل

اپنا احوالِ دلِ زار کہوں یا نہ کہوں
ہے حیا مانعِ اظہار کہوں یا نہ کہوں

شکوہ سمجھو یا اسے کوئی شکایت سمجھو
اپنی ہستی سے ہوں بیزار کہوں یا نہ کہوں

اپنے دل ہی سے میں احوال گرفتاری دل
جب نہ پاؤں کوئی غمخوار کہوں یا نہ کہوں

میں تو دیوانہ ہوں اور ایک جہاں ہے غماز
گوش ہیں در پسِ دیوار کہوں یا نہ کہوں

آپ سے وہ مرا احوال نہ پوچھے تو اسد
حسب حال اپنے میں اشعار کہوں یا نہ کہوں

رام کلی نے یہ غزل مرزا کے عین مقابل بیٹھ کر گائی اور دھن پر نانہ د ادا کے کرشمے اور بھاؤ کے انداز دکھائے۔ اس وقت مرزا شکار تھی اور وہ خود شکار بنی ہوئی تھی۔ رام کلی نے عجیب کیفیتوں سے بھاؤ کے ساتھ ایک ایک مصرعہ کی تقسیم کر کے گائی۔ مرزا مسرور تھے۔ حاضرین لطف و سرور کے نشے میں چور تھے۔ رام کلی نے مطلع کو اس انداز سے ادا کیا گویا اپنے

دل کی بے تابی اور بے قراری ظاہر کرنا چاہتی ہے۔ مہندی میں رچے ہوئے ہاتھ دل پر رکھکر مرزا کے رُو برو سراپا آرزو ہو ہوگئی۔ پھر گھونگھٹ کی اوٹ سے فتنہ گیں نگاہوں کی ادائے محبوبی دکھاکر (حیا مانع اظہار) کی کیفیت جتاتی رہی اس طرح پوری غزل شادی مرزا کے سرور کو سازو نازِ حُسن سے اُبھارا گیا۔ بلوان اس منظر کو فاتحانہ انداز سے دیکھ رہا تھا۔

رام کلی نے مقطع کی تکرار پر ادا و غمزہ کے ایسے ایسے جتن دکھلائے کہ ایک ایک لفظ کی خود تصویر بن گئی۔ پوری محفل حیران و ششدر تھی۔ اس سے پہلے اگرچہ بہت مجرے دیکھے گانے سنے لیکن یہ کمالات پہلے کا ہے کو دیکھے تھے۔ رام کلی کا یہ نقشہ دیکھکر دوسری طوائفیں فکرمند ہوئیں کہ اس کے بعد اپنا نقشہ جمنا دشوار نظر آرہا ہے۔ سب سے زیادہ فکر خورشید کو تھی۔ جس نے بلوان کو اپنے جال میں پھنسا رکھا۔ اسے وہم نے گھیر لیا کہ کہیں یہ سونے کی چڑیا اُڑ کر رام کلی کی زلفوں کی اسیر نہ ہو جائے۔

اس کے بعد بلوان نے خورشید کو اشارہ کیا کہ رام کلی کو کہے کہ اپنا کام کرے جس کے لئے اسے لایا گیا ہے۔ خورشید نے رام کلی کو اشارہ کیا لیکن رام کلی ہمت ہار چکی تھی وہ خود سازشوں کا شکار ہو چکی تھی اشارے اشارے میں رام کلی نے معذوری کا اظہار کر دیا اس انکار پر بلوان پریشان ہوا اس کے تمام منصوبے خاک میں مل رہے تھے اس کے سارے وار خالی جا رہے تھے۔ اس نے خورشید کو اشارہ کیا کہ تم خود اس کام کو سرانجام دو خورشید تیار ہو گئی۔ اس نے پاؤں میں گھنگرو باندھے اور سازندوں کو

اشارہ کیا کہ دُھن نکالیں۔ خورشید نے انہیں گانے کا مکھڑا دیدیا۔ وہ دُھن کی دُھن میں مصروف ہو گئے۔ خورشید نے دُھن گنگنائی اور پھر غزل شروع کی۔

غزل

بے اعتدالیوں سے سبک سب سے ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے
پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے
ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہی اپنی قسم ہوئے
سختی کشانِ عشق کو پوچھے ہے کیا خبر
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے
تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے
لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے
اللہ رے، تیری تندیٔ خو جس کے بیم سے

اجزائے نالہ دل میں میرے رزق ہم ہوئے
اہلِ ہوس کی فتح ہے ترکِ نبردِ عشق
جو پاؤں اُٹھ گئے وہی ان کے علم ہوئے
نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے
جو واں نہ کھنچ سکے سو وہ یاں آکے دم ہوئے
چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

○

خورشید نے غزل کے کئی شعر تو بڑے ہی ناز نخرے سے سُنائے لوگ جھوم جھوم گئے اور مرزا صاحب لطف اندوز ہوتے رہے۔ دو ایک شعر ایسے بھی تھے کہ جس سے براہِ راست بلوان پر چوٹ پڑ رہی تھی اور بلوان کھسیانی ہنسی ہنس کر ٹال گیا۔ خورشید نے تھوڑی بادہ گل گوں جامِ بلوری میں ڈالی اور مرزا صاحب کے سامنے چلی گئی۔ اس نے اپنی پختہ کاری سے مرزا کو راغب کیا۔ لیکن مرزا ٹالتے رہے آخر میں خورشید نے معشوقانہ ضد سے کام لیا۔ قسمیں کھائیں اور رام کلی کی قسم دے دی۔ اور جامِ شراب مرزا کے منہ کو لگا ہی دیا۔ مرزا دو چار گھونٹ پی گئے۔ بلوان سنگھ اور اس کی پارٹی نے خوشیوں کے اظہار کا کہرام مچا دیا۔ مرزا کے مخلص دوست بازی ہار گئے۔ اُن پر اوس پڑ گئی۔

رام کلی بھی رنجیدہ خاطر ہوئی لیکن دل میں کہہ رہی تھی کہ چلو ٹھیک ہوا اس راہ پر تو آئے اب مرزاجی کو میرے کوٹھے تک آنا دشوار نہ ہوگا۔ اور آئیں گے تو مجھے خاطر و مدارات میں کوئی تکلف نہ رہے گا۔ مرزا جی پی کر مدہوش تو نہ ہوئے۔ لیکن نشہ کے پردے میں موج شراب ناچنے لگی۔ ہلکا ہلکا سرور آگیا۔ آنکھوں کے ڈورے سُرخ ہو گئے۔ گال تمتما سے گئے خدام ادب نے آکر عرض کیا کہ کھانا چُن دیا گیا ہے۔ تشریف لے چلئے۔ مرزا صاحب اُٹھے اور ساتھ ہی اہل محفل بھی اُٹھ گئے۔ کھانے کا اہتمام شامیانوں میں کیا گیا تھا۔ خورشید تو بلوان کے پہلو میں جاکر بیٹھ گئی اور رام کلی کو مرزاجی کے پہلو میں جگہ دی گئی۔ کھانے میں بھی بڑی پیاری نوک جھونک رہی۔ کچھ بے تکلف احباب نے مرزاجی پر خوب خوب پھبتیاں کسیں اور مرزاجی بھی برجستہ ترکی بہ ترکی جواب دیتے رہے۔ کبھی کبھی لطیفہ گوئی بھی ہو جاتی تھی۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو پان گلوری کا شغل شروع ہوا اور لوگ بڑی بے تکلفی سے فرش پر آرام کرنے کے لئے دراز ہو گئے پھر دن ڈھلے چائے کا دور شروع ہوا اور اس سے فارغ ہو کر پھر بزم سرور آراستہ ہوئی۔ رات کے کھانے کے بعد ساری رات یہ محفل نشاط و کیف برپا رہی۔ ناچ گانے کی بزم آرائیاں ہوتی رہیں آخر علی الصبح اس محفل کی آخری چیز رام کلی نے گائی۔ اور اس کے ساتھ ہی محفل برخاست ہوئی۔ لوگ اُٹھنے لگے اور روانگی کا اہتمام ہونے لگا۔ رام کلی اور خورشید اور دوسری طوائفیں

مرزا صاحب کو رخصتی سلام کرنے آئیں مرزا صاحب نے ہر ایک کے فن کی تعریف کی۔ مرزا صاحب نے انعام کے لئے اشرفیوں سے بھری ہوئی مخملی تھیلیاں سامنے رکھ دیں۔ بڑے استادوں اور نائیکہ نے شکریہ کے ساتھ تھیلیاں سنبھال لیں ''

عشق پر زور نہیں

غالب انسانی خودی کا شناسا ہے وہ اپنے ہنگامہ پرور ماحول میں ایسی کیفیتیں تلاش کرتا ہے۔ جو انسان خودی کے حق میں سازگار ثابت ہوں۔ اور جو انسان کو بلند پروازی کے لئے بال و پر مہیا کر سکیں اس تلاش میں غالب کی نظر غم پر آ کر ٹھہر جاتی ہے۔ کیونکہ یہی چیز دراصل زندگی کی بنیادی محرک ہے۔

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے زندگی غم سے نجات پائے کیوں

زندگی اس غم کو دو حصوں میں بانٹ دیتی ہے ایک غم روزگار اور دوسرا غم عشق۔ یہی دو حصے زندگی کے تمام ہنگاموں کی بنیاد ہیں۔

غم اگرچہ جاں گسل ہے پر کہیں تو کیا کہ دل ہے
غم عشق اگر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا !!

غم روزگار ہماری خارجی زندگی میں انسانی قوتوں کو ہر لمحہ نئی فکر نئی سوچ اور نئی بات بخشتا رہتا ہے۔ اسی سے جسم کو صحت مندی کی ضمانت ملتی ہے اور غم عشق باطن کی اصلاح کرتا ہے۔ اس سے انسانی خودی (ذات) کی پرورش ہوتی رہتی ہے۔ یہ غم جو ہر حیات کو نکھرنے اور اُبھرنے کا موقع دیتا ہے اور خود وسیلہ بنتا ہے۔

غالب شاعر ہے اور شاعر ہمیشہ حال و قال دونوں میں مبالغہ کو روا سمجھتا ہے اس لئے مرزا غالب جس طرف جھکتے ہیں۔ اس کے ہو رہتے ہیں اگرچہ وہ اعتدال کی اقدار سے واقف ہیں۔ لیکن اعتدال کو ان کی زندگی میں کم دخل رہا ہے۔ وہ غم روزگار سے بھی آشنا ہیں۔ لیکن غم عشق کی جانب زیادہ مائل نظر آتے ہیں۔

اگرچہ غم روزگار نے غالب کی زندگی کو تلخ کر دیا تھا۔ بلکہ بقول غالب ان کا جینا حرام کر دیا تھا۔ لیکن وہ غم عشق کی اہمیت کے حد درجہ قائل ہیں۔ اس کے بغیر وہ انجمن ہستی کو بے رونق سمجھتے ہیں۔

رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

خرمن میں جب تک برق آسودہ نہ ہو جائے۔ وہ شعلے کہاں سے اٹھیں گے جو محفل میں شمع کا کام دے سکیں۔ اس غم عشق نے غالب کو دنیا کا سب سے بڑا تاجدار بنا دیا۔

ء

سخن از عالمِ دگر دارم
ہمدم و راز داں نمی خواہم
گر بود خود سروش دمی سرائے
با خودش ہم زباں نمی خواہم
سینہ صافم، قلندرم، ہستم
راز خود را نہاں نمی خواہم

غالب کے نزدیک عشق کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ہونا یا نہ ہونا کسی کے بس کی بات نہیں ہے کہ یہ اکتسابی نہیں ہے بلکہ خود فطرت ودیعت کرتی ہے"

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

عشق کی جولانگاہ صرف میدانِ حیات ہی نہیں بلکہ جنت گردوں سے اوپر بھی جو کچھ ہے وہ اس کی زد میں ہے۔ یہی قوت عشق وجدان کی پرورش کرتی ہے۔

غالب کے نزدیک عشق کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ عشق ہی ذرے کو صحرا اور قطرے کو سمندر کی وسعت بخشتا ہے۔ یہی قوت قلب و نظر کو آفاقی جولانیاں عطا کرتی ہے۔

شوق ہے ساماں طراز نازشِ اربابِ عجز
ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

اگرچہ غمِ عشق کی خلش ایک مستقل آزار ہے۔ لیکن یہ ایک ایسا آزار ہے جو زندگی کے باقی تمام رنج و غم کو اپنے ماتحت لے آتا ہے غالب نے اس کی ترجمانی یوں کی ہے۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا

غالب کے نزدیک عشق کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ جب انسان خارجی قوتوں میں گھر کر اپنی ہستی کو مجبور پاتا ہے تو صدمات کی تاب نہ لا کر چیخ اٹھتا ہے اس لئے کہ وہ اپنے خارجی ماحول کو اپنی نہج پر ڈھال لینے کی ہمت نہیں رکھتا لیکن جب وہ عشق کی وادیوں میں قدم رکھتا ہے تو زندگی کے متعلق اس کا نقطہ نظر ہی بدل جاتا ہے اب وہ خارجی دنیا کو اپنے تدبیر پر سمجھتا ہے اور جینے کا حقیقی راز پالیتا ہے۔

غالب کے نزدیک عشق کی پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسان کو ہر اس بندھن سے آزاد کر دیتا ہے جو اسے عام زندگی کی سطح سے اوپر نہیں اُٹھنے دیتی اس ایک تلخ گھونٹ سے زندگی کی ساری فضا شیریں و خوشگوار ہو جاتی ہے اور ایک عاشق کو اپنا مرکز حیات اپنے معشوق کی صورت میں مل جاتا ہے یہ حسن و جمال کا مرکز عاشق کو اپنی سمت کھینچتا ہے۔ جب وہ اس میں جذب ہو جاتا ہے تو یہ صورت حال اسے ایک انوکھا مزاج عطا کر دیتی ہے پھر وہ رنگ و بوئے

گل سے گذر کر خود حقیقت گل کا متلاشی ہو جاتا ہے۔

سطوت سے تیرے جلوۂ حسنِ غیور کی
خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گل

★

مرزا غالب کے نزدیک عشق کی چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ عشق انسان کے قلب و دماغ پر اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہتا۔ ہو سکتا ہے کہ ایک عاشق آرزوئے وصال کی شدت میں تڑپ کر تاثیرِ عشق سے انکار کر دے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ عشق تاثیر سے نومید نہیں۔

کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر!
پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

جگر چاک ہونے میں جو آزار ملتا ہے۔ قلب کی گہرائیوں میں اس کا موجود ہونا اشد ضروری ہے اس سے محروم انسان اس کی لذت سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔

-:ہ-

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں
طاقت بقدرِ لذتِ آزار بھی نہیں!

پتنگ بازی کے جلسے کو ختم ہوئے کئی روز گذر گئے۔ لیکن اس محفل کے چرچے تازہ بتازہ ہو جاتے تھے۔ طوائفوں کے ڈیروں میں مرزا

نوشہ کی دھوم ہے اور رام کلی کے بارے میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ دراصل یہ سب کچھ بلوان نے مرزا سے ایک انتقام لینے کے لئے کیا تھا اور خورشید کو اس کا ذریعہ بنایا تھا۔ لیکن اس محفل میں رام کلی کے انداز دیکھ کر خورشید کو نقشہ ہی نظر کچھ اور نظر آیا۔ خورشید یہ سمجھنے پر مجبور تھی کہ مرزا رام کلی سے بے تکلف ہو کر ملنا چاہتے تھے۔ اور بلوان نے اپنے یار کی خواہش پوری کرنے کے لئے یہ محفل رچائی تھی اور اس طرح رام کلی کو مرزا سے چونچلے کرنے پر آمادہ کیا گیا۔ چنانچہ بلوان اور خورشید کے درمیان خوب تو تو میں میں رہی۔ جھگڑے اٹھے نا چاقی بڑھی بلوان نے ہر چند صفائی کی کوشش کی اور گنگا بل اٹھانے پر تیار ہو گیا۔ لیکن خورشید کو اس کی کسی بات پر یقین نہ آیا۔ اگرچہ بلوان نے ہزار قسمیں کھائیں کہ وہ محض مرزا کو چھیڑنے جام شراب اس کے منہ لگانے اور اس کی پارسائی کا تمسخر اڑانے کے لئے کیا گیا تھا۔ دراصل خورشید خود مرزا پر قربان تھی اور مرزا کی دریا دلی اور فیاضی سے سب کچھ حاصل کرنا چاہتی تھی۔ لیکن رام کلی کے حریف بن جانے سے اس نے اپنے دل میں ایک جلن محسوس کی۔ چنانچہ بات کہیں سے کہیں پہنچی۔

ادھر مرزا اپنے دوستوں میں رام کلی کے حسن و جمال کے تذکرے کرنے لگے۔ مرزا پر رام کلی کی اداؤں کا اثر ہو چکا تھا اور عشق جاگ اٹھا تھا۔ ایک روز اسی فکر میں چند شعر کہہ دیئے۔

۵

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے
نگہِ چشمِ سُرمہ سا کیا ہے

پھر جو ذرا سنبھلے تو کہا۔

ع :۔

کر دیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے

مرزا اب اپنے یار لوگوں سے بھی دل کی بات چُھپانے لگے۔
ایک روز رام کلی کی یاد میں بیتاب ہو کر اُسے اپنے ہاں مجرے کے لئے بلا بھیجا۔ سلطنت مند نائکہ معاملہ کی تہ تک پہنچ گئی اور بڑے انداز سے مرزا کی نوازش کا شکریہ اور پھر نفی میں جواب دینے کے لئے خود مرزا کی خدمت میں حاضر ہو گئی۔ وہ مرزا کی نا تجربہ کار نو خیز عمر کے جذبات سے واقف تھی۔ نائکہ نے حاضر ہو کر رام کلی کی حاضری کی معذرت پیش کی اور عرض کیا۔ اے حضور ہمارے ایسے نصیب کہاں کہ اس گھر کی خاک ہمارے سر پر سایہ فگن ہو۔ حضور کے حکم کی تعمیل ہمارے لئے باعثِ فخر ہے۔ رام کلی آپ پر سو جان سے نثار وہ تو آپ کی ادنیٰ کنیز ہے۔ اس محفل کے بعد سے اُٹھتے بیٹھتے آپ ہی کا ذکر کرتی ہے۔ اور سوتے جاگتے آپ کی مہربانیوں کو یاد کرتی رہتی ہے۔ آپ کا اُسے یاد فرمانا۔ اس کے لئے سب سے بڑی عزت ہے ہم جانتے ہیں کہ حضور

کے قدم ابھی تک کسی کوٹھے تک نہیں پہنچے۔ یہ سعادت ہمیں نصیب ہو نہ ہو نصیب۔ لیکن یہ دُنیا ہے دنیا کے رکھ رکھاؤ کا لحاظ کرنا ہی پڑتا ہے۔ ابھی اس کی مسّی کی رسم ادا نہیں ہوئی۔ ایک رئیس زادے کی طرف سے اس کی مسّی کی بات چلی ہوئی ہے۔ دستور کے مطابق اس رسم کی ادائیگی سے پہلے وہ کسی کے دروازے پر حاضر نہیں ہو سکتی۔ ہم اس گستاخی کی جراٗت کیسے کر سکتے ہیں کہ حضور کو اس رسم کی ادائیگی کی دعوت دیں۔ البتہ حضور غریب خانہ پر جب مناسب سمجھیں تشریف لائیں۔ جس دن جس وقت فرمائیں حضور کی خاطر تخلیہ کی محفل ہو سکتی ہے۔

نائکہ کا آخری جملہ سُن کر مرزا خوش ہوئے اور نائکہ کو انعام بخشا وہ رخصت ہو گئی۔ وہ تو چلی گئی لیکن مرزا کی آتشِ شوق کو تیز تر کر گئی۔ مرزا کو ان بازاری عورتوں کے ہتھکنڈوں کا کچھ علم نہ تھا۔ نائکہ نے مرزا کو پوری طرح شیشہ میں اُتار لیا۔ ایک شام جب مرزا دوستوں میں بیٹھے چوسر کھیل رہے تھے کہنے لگے کہ کیا حرج ہے کہ اگر کسی روز رام کلی کے مکان پر ایک تخلیہ کی بزم آراستہ ہو جائے۔ لُطف رہیگا۔

مرزا کی بات سُن کر سب گھبرائے لیکن جانتے تھے کہ رام کلی کا تصوّر کئی روز سے مرزا کو بے چین کئے ہوئے ہے۔ یہ عشق کا بھوت کسی منتر سے نہ اُترے گا۔ یار لوگ خاموش رہے۔ ابھی باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ داروغہ نے آکر خبر دی کہ ایک بائی جی آئی ہیں اور آپ سے

ملنے کا ارمان رکھتی ہیں۔ مرزا سمجھے کہ رام کلی کی نائیکہ آئی ہوگی۔ حکم ہوا کہ اُسے اندر لے آؤ۔ دوست اُٹھکر دوسرے کمرے میں چلے گئے"
خورشید چھم چھم کرتی اندر آگئی اور مرزا کے پہلو میں بیٹھکر لگی شکوے کرنے"

اے حضور قدیم جاں نثاروں کو آج تک نہ پوچھا اور نئی نوچی کو دو گھڑی کی ملاقات میں شرفِ ملاقات بخش دیا۔ اور وہ اتنی گستاخ کہ حاضری سے اس کو مجال انکار۔ مرزا نے کہا۔ خورشید کا مقام اور ہے۔ بلوان ہمارے بھائی ہیں اس رشتے سے خورشید ہماری بھاوج ہوئی۔ ہم ایسے بے غیرت نہیں کہ بھاوج کو اپنی بغل میں بلائیں یا خود اُٹھکر اس کی انجمن میں جائیں۔ خورشید ایک عیارہ عورت تھی بات کو ٹال گئی اور کہا۔ آپ نے میری حاضری کا سبب تو پوچھا ہی نہیں سلاچھے رشتہ دار ہیں ہمارے) مرزا کو پانی پانی کر دیا۔ مرزا سمجھ گئے کہ عیار عورت نے پختہ کاری کا ثبوت دیا۔ ہمارے ہی ترکش میں تیر رکھ کر ہم پر وار کر دیا ہے لیکن مرزا کے ترکش میں جواب کے لئے کوئی تیر نہیں تھا۔ وہ خود ہی اس بازاری عورت کو بھاوج کہہ چکے تھے اور آپ ہی کنجروں کے رشتے دار بن چکے تھے۔ خاموش رہنا ہی ہنر سمجھا اور فضا کو خوشگوار بنانے کے لئے سازندوں کو حکم ہوا کہ ساز لیکر بیٹھ جائیں۔ نغمہ سرائی کی محفل گرم ہوئی۔ دوست احباب بھی آکر بیٹھ گئے۔ خورشید نے اپنے مخصوص انداز میں غزل سُنائی۔ خورشید خاصی خوش گلو تھی ساتھ

ساتھ لگاوٹ کے اشارے کرتی رہی۔ مرزا داد دیتے رہے۔ گانا ختم ہوا۔ سازندے محفل سے چلے گئے خورشید اس انتظار میں تھی کہ مرزا کے دوست احباب بھی اُٹھ جائیں تو کچھ تخلیہ میں گفتگو کا موقع مل جائے۔ لیکن وہ کب اُٹھنے والے تھے۔ مرزا خود بھی نہیں چاہتے تھے کہ خورشید کو تخلیہ کا موقع دیا جائے۔ مرزا نے خورشید کو انعام دینا چاہا۔ مگر اس نے لینے سے انکار کر دیا اور عرض کیا۔ جب حضور کی طلبی پر حاضر ہوں گی تو ہزار بار انعام لوں گی۔ یہ تو میں اپنی مرضی سے حضور کی مزاج پُرسی اور سلام کے لئے آ گئی تھی۔ اس کے بعد خورشید رخصت ہو گئی۔

بنسی دھر کو خورشید کا اس طرح بے تکلف بغیر اطلاع کئے اور اجازت لئے بغیر چلے آنا پسند نہ آیا اور اس نے کھلے الفاظ میں مرزا سے کہا مرزا جی! ہم جس بلا سے بلوان کا پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں وہ تو آپ کے سر آنے لگی۔ بے پوچھ گچھ ان رنڈیوں کا چلے آنا بالکل غیر مناسب ہے۔ میں اس طور طریقے کو قطعی پسند نہیں کرتا۔ گھر کے ملازم سُنیں تو کیا کہیں کوئی دیکھ لے تو خیال کرے۔ دیوانخانے کی بات زنانخانے میں پہنچے تو کیا قیامت ٹوٹے۔

گھر اجداد شرافت کا مرکز ہے۔ امّی حضور نواب خاندان کی عزت ہیں ان کے کان میں بھنک پڑ جائے تو ذرا تصور کیجئے گھر کا نقشہ کیا سے کیا ہو جائے۔

مرزا نے کہا: ہم خود اس اندیشہ کو محسوس کرتے ہیں۔ بلوان آ جائے تو اس سے کہہ دیں گے۔ یقین مانو اب وہ دوبارہ یہاں نہ آئے گی۔

بنسی نے کہا۔ بلوان کی عدم موجودگی میں خورشید کو یہاں آنا ہی نہ چاہیئے تھا۔ میں تو کہتا ہوں اس میں کوئی راز ضرور ہے۔ بلوان بھی تو ہمارا خیر خواہ دوست نہیں ثابت ہوا۔ پتنگ کے جلسے میں اس نے کیا گل کھلائے ہیں؟ ایسی سازش تو دیرینہ دشمن بھی نہیں کرتے جو وہ کر گذرا ہے۔

مرزا نے کہا۔ بنسی یار کیا وعظ شروع کر دیا ہے۔ یہاں کون سی مسجد آباد ہے۔ ہم کیا کچھ نہیں کرتے صرف مے نوش نہیں ہیں۔ اپنا اپنا شغل ہے۔ کسی سے نفرت ہمارا شعار نہیں۔ خیر چھوڑو اس خشک موضوع کو یہ بتاؤ کہ اس روز جلسے میں رام کلی نے جو ہماری غزل گائی تھی۔ کیسی تھی؟

بنسی نے کہا۔ کیوں مرزاجی خیریت تو ہے آج وہ غزل بڑی یاد آئی ہے۔ غزل یاد آئی ہے کہ غزل گانے والی یاد آئی ہے۔ سچ پوچھو تو غزل در غزل دونوں کا جواب نہیں۔

مرزا نے کہا۔ ہمارا خیال ہے کہ رام کلی دوسری طوائفوں سے زیادہ صاحب علم و ذوق ہے۔

بنسی نے کہا "ہاں جی وہ ہر لحاظ سے دوسری طوائفوں سے بہتر ہے۔

مرزا نے اپنے شوق بے محابا کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ کسی دن اس کے ہاں جانا چاہیئے۔ وہاں ایک تخلیہ کی بزم آرائی ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے۔

بنسی نے مسکرا کر کہا۔ ہم تو یار کے ساتھ ہیں۔ جہاں لے چلے۔

چلے جائیں گے۔

ادھر خورشید کے دل میں رام کلی سے رقابت کی آگ بھڑک چکی تھی اس عیارہ نے رام کلی کی ماں سے مل کر اُسے آگاہ کیا اور کہا:

سنو بُوا ۔ ذرا اپنی نئی نویلی سے خبردار رہنا ۔ مرزا نوشہ بڑے عیار تماش بین ہیں انہوں نے اپنی محفل میں انعام واکرام کا جو پانسہ پھینکا ہے وہ تمہارے پھانسنے کو ایک جال ہے۔ اس دامِ فریب میں نہ آجایئو رام کلی کے سر پر مرزا کے عشق کا جن سوار ہوتا جارہا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو تم پنجرے کی کھڑکی کھول دو اور مرزا جی اس سونے کی چڑیا کو دبوچ کرلے جائیں ۔ رام کلی کمسن اور نادان ہے ۔ وہ ابھی پیار کی راہ پر نہیں چلی ۔ اس نے اگر دل لگا لیا تو تمہارے چہرے پر کالک لگ جائے گی اور وہ تمہارے خاندان کی عزت کو بٹہ لگا کر چلتی بنے گی۔ ہم طوائف کو سٹے دار عورتیں ہیں ۔ ہمارا کسی کے عشق میں مبتلا ہونا ہمارے لئے بڑی لعنت کی بات ہے۔ اگر ہم کسی کی دولت پر ہاتھ صاف کرنے کی بجائے کسی کی ہو رہیں یا اس کے عقد میں جانے کے ارمان رکھیں تو یہ طوائف کیخلاف ہے۔

نائیکہ نے کہا، شکریہ خورشید جان ۔ سمجھو کہ تمہاری نصیحت پلے باندھ لی۔ کیا مجال ہو وہ مرزا اس زینے پر قدم رکھ جائے ۔

خورشید نے کہا ۔ اے واہ بُوا تم بھی خوب سمجھی ۔ میں نے یہ تھوڑی کہا ہے۔ میں تمہارے نقصان میں کیوں راضی ہونے لگی اور تمہیں نقصان

کی بات کیوں سمجھانے لگی ۔ مرزا کو یہاں آنے دو ۔ وہ نوخیز دولت مند نوآموز عاشق ہے ۔ بیٹی کو اس سے الگ رکھو ۔ وہ اپنی دولت اس کوٹھے پر لٹا دیگا اور ہماری اس بازی میں مہرہ بن جائے گا ۔ رام کلی کا ہاتھ مرزا کی دولت تک جائے اس سے آگے نہ بڑھے ۔

اچھا ہوا میں چلی ۔ بلوان جی کے آنے کا وقت ہو رہا ہے ۔

خورشید آگ لگا کر چلی گئی ۔ نائیکہ نے رام کلی کو بلایا اور خوب پڑھایا ۔ اچھی طرح سمجھایا ۔ رام کلی بے چاری اس کے ہاتھ میں تاش کا پتہ تھی ۔ لیکن دل میں مرزا کی طرف سے زخم کھائے بیٹھی تھی ۔

دوسرے روز رام کلی کا ملازم ایک پرچہ لیکر مرزا کے حضور پہنچا ۔ وہ کاغذ عطر میں بسا ہوا تھا ۔ مرزا نے کاغذ کھولا تو اس پر شعر لکھا ہوا تھا ۔

ع :-

ہم بھی تسلیم کی خُو ڈالیں گے
بے نیازی تیری عادت ہی سہی

★

مرزا نے اس کاغذ کی پشت پر ایک شعر لکھا ۔

ع کبھی تو اس دلِ شوریدہ کی بھی داد ملے
کہ ایک عمر سے حسرت پرست بالیں ہے

کاغذ اسی ملازم کو دیکر روانہ کردیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد رام کلی کا نوکر پھر حاضرِ خدمت ہیں اور عرض کیا کہ بائی جی نے سلام بھیجا ہے اور کہا ہے کہ کل اماں کہیں جا رہی ہیں۔ موقعہ نکال کر شام کے بعد تھوڑی سی دیر کے لئے حاضرِ خدمت ہوں گی۔

مرزا نے ملازم کو انعام بخشا اور ایک کاغذ پر شعر لکھکر بھیجدیا۔

ع:-

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں

★

دوسرے روز شام کے وقت ہی مرزا کی خوشی کا عالم دیکھنے کے لائق تھا۔ وہ سرِ شام بے تابی سے چھت پر ٹہلتے رہے۔ ہر لمحہ نیچے گلی کی طرف دیکھتے خدا خدا کر کے رام کلی کی سواری نظر آئی۔ مرزا فوراً نیچے اُترے اور دیوان خانے میں جا کر بیٹھ گئے۔ رام کلی محبوب ادا سے آئی اور بڑے انداز سے سلام کر کے چپ چاپ کھڑی ہو گئی۔ مرزا پر عالمِ کیف طاری تھا۔ آثارِ شباب کا تازہ خون رگ رگ میں تیزی سے گردش کرنے لگا۔ مرزا اُٹھے اور اس کا ہاتھ تھام کر بڑے تپاک سے قریب بٹھالیا۔ رام کلی شرمائی لجائی سمٹی سمٹائی بیٹھ گئی۔ اس وقت رام کلی کو دیکھکر محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایک کمسن دوشیزہ حجاب اندر حجاب ایک

مجبوبہ پری تمثال ہے جو پہلی مرتبہ اپنے عاشق زار کے سامنے جلوہ گر ہوئی ہے۔ مرزا نے اس کے معصوم چہرے پر نگاہیں ڈال کر بے ساختہ یہ شعر پڑھا۔

ع:-

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں!

شعر سُن کر رام کلی نے ادائے خاص سے شرما کر آنچل میں منہ چھپا لیا۔ مرزا نے پھر بے ساختہ شعر کہا۔

ع:-

شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

اب تو رام کلی پسینے میں شرابور ہو رہی تھی۔ وہ واقعی الٹر دوشیزہ تھی۔ ابھی اس نے رنڈیوں والی عیاری نہیں سیکھی تھی۔ وہ دوہری ہو کر دیوار سے جا لگی۔ مرزا نے اسے اس عالم میں دیکھ کر پھر شعر کہا۔

ع:-

دل لگا کر لگ گیا ان کو بھی تنہا بیٹھنا
بارے اپنی بیکسی کی ہم نے پائی دادیاں

مرزا نے رام کلی کی خاطر تواضع شروع کی رام کلی نے ہر چند تکلف برتا۔ لیکن مرزا چاہتے تھے کہ وہ غنچہ ناشگفتہ کھل جائے۔ رام کلی

نے کہا آپ کی ادھوری غزل کے چند شعر بصد مشکل حاصل کیے ہیں اجازت ہو تو عرض کروں۔ مرزا نے کہا۔ کہئے تو سازندوں کو حاضری کا حکم دیا جائے رام کلی نے کہا۔ جی اس وقت نہیں پھر کبھی سہی۔ اس وقت تنگی وقت سے مجبور ہوں۔ مرزا نے کہا۔ بہت اچھا تو فرمایئے رام کلی ذرا سنبھل کر بیٹھ گئی اور شعر سنانے شروع کیے۔ وہ ترنم سے دھیمے سروں میں شعر سنا رہی تھی۔

کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجئے ہم نے مدعا پایا
عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا
دولت داد دشمن ہے اعتماد دل معلوم
آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا
غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا

★

رام کلی نے اشعار اس ترنت اور انداز سے پڑھے گویا ایک ایک شعر اس کے حسب حال ہے۔ اور وہ اپنی بے چارگی دل کی داستان سنائے جا رہی ہے۔ یہاں تک کہ تیسرے شعر پر اس کی سُر نگیں

آنکھوں سے بے اختیار آنسو چھلک گئے۔ مرزا پر اس کا ایک خاص اثر ہوا اور اپنی غزل کی تشریح پائی۔ مرزا نے نہایت نفیس شراب رام کلی کے لئے منگا رکھی تھی۔ مرزا نے شیشہ و جام اس کے سامنے رکھ دیئے رام کلی نے کہا۔ مجھے اپنی محبت کی قسم میں اس شغل سے مانوس نہیں ہوں مرزا نے پوچھا۔ کیا اپنے کوٹھے پر بھی۔۔۔۔ رام کلی نے بات کاٹ کر عرض کیا۔ کوٹھے کی بات اور ہے۔ وہاں تو میں اماں کے ہاتھ میں تاش کا پتہ ہوتی ہوں۔ ہر آنے والے مہمان کی تواضع میرے ذمہ ہوتی ہے۔ وہاں اگر شریک ناؤ نوش نہ ہوں تو مہمان اپنی سبکی سمجھتا ہے۔ مرزا نے شوخی سے کہا۔ اور یہاں اگر ہم اپنی سبکی سمجھیں تو !!!

رام کلی نے کوئی جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور اپنے محبوب عاشق کی دلجوئی کی خاطر اٹھی اور ایک جام بھر کر سرو قد ہو کر مرزا کو پیش کر دیا۔ اب انہیں تاب انکار کیسے ہوتی۔ جھجک اور آن تو ٹوٹ ہی چکی تھی۔ اس کا منظر تو اس روز رام کلی نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ مرزا نے جام لے لیا اور پی گئے۔ پھر رام کلی نے خالی شیشہ و جام مرزا کے آگے بڑھا دیا۔ مرزا سمجھ گئے چنانچہ جام بھر کر رام کلی کی نذر کیا اس نے جام لے لیا اور بڑے ناز و نخرے سے جام خالی کیا اور جانے کی اجازت چاہی۔ رام کلی نے چلتے چلتے مرزا سے اپنے گھر آنے کا وعدہ لے لیا۔

مرزا نے رام کلی پر حسرت بھری نگاہ ڈالی اور کہا۔

پھڑکے ہے شبنم آئینہ برگِ گُل پر آب
اے عندلیب! وقتِ وداعِ بہار ہے

اب رام کلی کا نوکر مرزا کے ہاں آنے جانے لگا تھا۔ دوست احباب مرزا کے دل سے مجبور تھے۔ کچھ نہ کہتے۔ مرزا نے رام کلی کے ملازم کی معرفت تخلیہ کی بزم طے کرلی اور ایک رات رام کلی کے گھر پہنچ گئے۔ رام کلی کی ماں نے مرزا کی بہت تواضع کی رام کلی اپنی خوش بختی پر خوش ہو رہی تھی۔ نائیکہ کسی کام کو کمرے سے باہر گئی تو رام کلی نے مرزا کا یہ شعر دہرایا:"

س:-

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

مرزا نے مسکرا کر کہا۔ یہ بات تو پرانی ہو چکی۔ کوئی نئی بات زمانیے رام کلی نے کہا۔ جی ہم کوئی شاعر نہیں ہیں کہ جو موقع آنکھ سے دیکھا ذہن نے ترجمانی کردی۔ ہم تو اپنے حافظہ سے کام لیتے ہیں۔ کلام دوسروں کا زبان ہماری۔ اور بندہ پرور کنیز کو تو پہلی بار یہ شعر کہنا نصیب ہوا ہے۔ مرزا نے بڑی شوخی سے کہا۔ شعر پڑھنا کہئے شعر کہنا نہیں۔ شعر تو ہم کہتے ہیں۔ رام کلی شرما گئی اور کہا۔ ہم نے معظم علی کی شاگردی نہیں کی۔ یہ ادب آپ کے گھر کی لونڈی ہے اور ہمارے گھر کی زینت۔ مرزا نے کہا۔ خوشی ہوئی کہ آپ نے بہت سلجھا ذہن پایا ہے۔ رام کلی نے ہنس کر کہا۔ دلجوئی کا شکریہ!

اتنے میں نائیکہ آ گئی مرزا کچھ کہتے کہتے رک گئے اس نے تاڑ لیا اور بولی۔ مرزا حضور تکلف کی ضرورت نہیں اسے اپنا ہی گھر سمجھیے آپ کے لائق تو نہیں۔ لیکن ہم آپ کے خادم ضرور ہیں۔ مرزا نے کہا۔ بڑی بی

تم اپنے گھر اور کوچے کے بارے میں کیا جانو۔ لو ہم سے اس کی تعریف سُنو۔

ع :

کم نہیں جلوہ گری میں تیرے کوچے سے بہشت
یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

★

نائیکہ نے کہا۔ ہم حضور کی باتیں سمجھنے کے لئے عقل کہاں سے لائیں۔ نہ پڑھے نہ لکھے۔ اچھا حضور آپ بے تکلف تشریف رکھیں۔ اور رام کلی مرزا جی کا خیال رکھنا۔ تو شرمانی بہت ہے۔ کبھی چُپ بیٹھی رہے اور مرزا جی کی خاطر تواضع سے غفلت برتنے۔ یہ کہکر بڑی بی باہر چلی گئی۔ رام کلی اور مرزا نوشہ باتیں کرنے لگے۔ رام کلی نے بتایا کہ اسے شعر وادب سے بڑی دلچسپی ہے۔ مرزا اس کا ذوق معلوم کرکے بہت خوش ہوئے اور رام کلی کی فرمائش پر شعر سناتے رہے۔ پھر رام کلی نے جام وشیشہ آگے رکھدیا۔ دونوں محبوب مزے لے لے کر پیتے رہے۔ آج مرزا جی بہت خوش تھے جی میں کہہ رہے تھے کہ اگر بڑھیا مان جائے تو رام کلی کو ہمیشہ کے لئے اپنی زندگی میں داخل کرادوں۔

رام کلی نے اماں کو آواز دیکر کہا کہ سازندوں کو اندر بھیج دیجئے۔ پھر رام کلی نے مرزا سے کہا۔ میں نے آپ کی ایک غزل حاصل کی ہے۔ جس کا مطلع ہے۔

محرم نہیں۔ ہے تو ہی نواہائے راز کا!!
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

★

مرزا نے مسکرا کر کہا۔۔ یہی سنایئے۔ سازندوں نے ساز سنبھالے دھن نکالی۔ رام کلی نے گانا شروع کیا۔

غزل

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا
رنگِ شکستہ صبحِ بہار نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا
تو اور سوئے غیر نظرہائے تیز تیز
میں اور دُکھ تیری مژہ ہائے دراز کا
میں لبکہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے
ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا
تاراجِ کاوشِ غمِ ہجراں ہوا اسد
سینہ کہ تھا دفینہ گہر ہائے راز کا

★

مرزا نے بڑے سرور سے یہ غزل سُنی اور رام کلی سے کہا۔ تمہیں یہ غزل کسی نے ادھوری پہنچائی ہے۔ باقی شعر بھی لکھ لو۔

عرفہ ہے ضبط آہ میں میرا وگرنہ میں
طعمہ ہوں ایک ہی نفسِ جانگداز کا
کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض اس گرہِ نیم باز کا!!

★

رام کلی نے ہنس کر کہا۔ وعدہ فرمایئے کہ کسی دوسری صحبت میں ان اشعار کی تشریح بھی فرما دیں گے۔ مرزا نے کہا۔ بصد شوق۔

مرزا کو والد کا لحاظ نہ ہوتا تو وہ رام کلی کے گھر بلا تکلف آمدورفت جاری رکھتے اور عشق و عاشقی کے کھیل کھُل کر کھیلتے۔ لیکن درِ محبوب اور کوچہ یار تک ہو آنے کے باوجود عالم آمدورفت پر ہنوز بیباک نہ ہوئے تھے دوسرا سبب یہ بھی تھا کہ یار دوستوں سے ابھی تک رکھ رکھاؤ قائم تھا اور ان سے بچ کر ہر روز گھر سے غائب ہو جانا آسان نہ تھا اس لئے بھی کہ وہ یار دوست اس قماش کے نہ تھے کہ مرزا کے ساتھ مرزا کی راہ پر چل نکلتے۔ اور کچھ خاندانی اور طبعی شرافت بھی دامن گیر تھی۔ چنانچہ مرزا نے صبر و ضبط سے کام لیا اور اپنی طبیعت پر جبر کیا اور دل کی بے تاب حسرتوں کو دبانے کی کوشش کی۔ کوچہ یار

سے وصیان ہٹانے کے لئے۔ جو تدبیر اختیار کی وہ اور بھی بُری تھی ۔ یعنی مرزا نے شغل مے نوشی اس کا علاج تجویز کیا۔ تنہائی کی رفاقت کے لئے جام ومینا کو گلے لگا رکھا رام کلی کے تصوّر سے باتیں کرنے لگے۔
مرزا نے رام کلی کو تحفہ بھیجنے کے لئے ایک خوشنما مرصع ایرانی کلاہ تیار کرائی جس میں یمنی عقیق اور تاجدار موتی جڑے ہوئے تھے۔ مرزا نے ایک پرچہ پر ایک شعر لکھا اور یہ کلاہ رام کلی کے نوکر کے ہاتھ بھجوا دیا۔ شعر یہ تھا ؎

تیرے جواہر طُرفہ کلاہ کو کیا دیکھیں
ہم اوجِ طالعِ لعل وگہر کو دیکھتے ہیں

★

جب خورشید کو اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی اور مرزا کو اپنی طرف مائل الطاف نہ پایا تو انتقام پر اُتر آئی ایک شب اُس نے بلوان سنگھ سے شکایت کی کہ جس روز آپ باہر گئے ہوئے تھے میں مرزا جی کے ہاں چلی گئی تھی کہ انہیں ان کی تازہ غزل سُنا آؤں ۔ میں تو ان کے ہاں یہ سمجھ کر چلی گئی تھی کہ وہ آپ کے دوست ہیں مگر انہوں نے تخلیہ میں مے نوشی شروع کر کے مجھ سے چھیڑ چھاڑ کا ارادہ کیا میں ان کی نیت بدلتی دیکھ کر وہاں سے عزت بچا کر بھاگ آئی۔
اب بلوان کے دل میں کشیدگی پیدا ہو گئی۔ بلوان نے دونوں

کے ذریعہ مرزا سے اس کا ذکر پہنچایا تو مرزا کو خورشید کی عیاری معلوم کر کے بہت دُکھ ہوا مرزا نے بلوان کو بلایا اور سارا قصّہ کہہ سنایا۔ بلوان کو مرزا کی شرافت پر یقین آگیا۔ لیکن دل صاف نہ ہوا۔

بلوان نے جا کر خورشید سے ذکر کیا وہ حرافہ طوائف تھی قسمیں کھائیں اپنی صداقت کا اُسے یقین دلایا۔ بلوان خورشید پر دل وجان سے فدا تھا۔ وہ محبوبہ دلنواز کی باتوں پر یقین لے آیا اور دل میں مرزا کی طرف سے خلش پیدا کر لی۔ خورشید نے بھی دل ہی دل میں مرزا کے خلاف ہزار منصوبے باندھ لئے۔

خورشید پر مرزا اور رام کلی کے ربط وضبط کا حال کھُل چکا تھا وہ رام کلی کو اپنا رقیب سمجھ چکی تھی۔ ایک روز رام کلی کی اماں وہ کلاہ دکھانے خورشید کے ہاں آگئی۔ اور خورشید کو مرزا کا بھیجا ہوا تحفہ دکھایا۔ بظاہر خورشید نے خوشی کا اظہار کیا اور اپنی ناراضگی قطعی طور سے ظاہر نہ ہونے دی۔ اور باتوں ہی باتوں میں مرزا کے بارے میں خوب لگائی بجھائی کی اور جو من گھڑت کہانی اپنے بارے میں بلوان کو سُنائی تھی وہ اُسے بھی سُنا دی اور ساتھ ہی ساتھ رام کلی اور مرزا کے درمیان معاشقہ کی جھوٹی سچی کہانیاں بھی سُنا دیں۔ اُسے یقین دلایا کہ رام کلی بُری طرح سے مرزا پر مائل ہے اور مرزا بے طرح سے گھائل ہے۔ نائیکہ یہ باتیں سُن کر گھبرا گئی۔ وہاں سے آکر اُس نے رام کلی کو سخت تنبیہہ کی کہ وہ مرزا سے زیادہ التفات نہ بڑھائے

اور تنہائی میں بالکل نہ ملے۔

ادھر مرزا نے بلوان سے ازسرنو دوستی کے تعلقات درست کر لئے تھے۔ پھر پتنگ بازی کا مشغلہ شروع ہوا۔ آگرہ میں بلوان کے ایک دوست رئیس زادہ کنہیا لال تھے اُسے بھی پتنگ بازی کا شوق تھا۔ اس نے تجویز پیش کی کہ ابکے جو مقابلہ ہو وہ کوٹھے کی جگہ کسی کھُلے میدان میں قرار پائے۔ اور اُسی میدان میں دوستوں کی دعوت کی بزم آرائی بھی ہو۔ تجویز معقول تھی۔ دونوں نے تسلیم کر لی۔ اس کی خبر رام کلی کو بھی ہوئی اس نے نوکر کے ہاتھ کہلا بھیجا کہ ہماری فرمائش ہے کہ اب کی بار جو مقابلہ ہو اس کے لئے آپ ایک نظم کہیں اس پتنگ بازی کے فن میں آج تک کسی شاعر نے توجہ نہیں دی۔ پھر وہ نظم مجھے بھجوا دی جائے میں یاد کر کے حضور کو سناؤں گی۔ مرزا کی طبع رسائی کے لئے کیا مشکل تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایک مرصع قطعہ کہہ ڈالا۔

قطعہ

ایک دن مثل پتنگ کاغذی
لے کے دل سر رشتہ آزادگی
خود بخود کچھ ہم سے کنیا کہنے لگا
اس قدر بگڑا کہ سر کھانے لگا

میں نے کہا اے دل ہوائے دلبراں
بسکہ تیرے حق میں رکھتی ہے زیاں
نیچ ہیں ان کے نہ آنا زینہار
یہ نہیں ہیں کسی کے یار غار
گورے پنڈے پر نہ کر ان کے نظر
کھینچ لیتے ہیں یہ ڈورے ڈال کر
اب تو مل جائیگی ان سے تیری سانٹھ
لیکن آخر کو پڑے گی ایسی گانٹھ
سخت مشکل ہوگا سلجھانا تجھے
قہر ہے دل ان کا اُلجھانا تجھے!
یہ جو محفل میں بڑھاتے ہیں تجھے
بھول مت اس پر اڑاتے ہیں تجھے
ایک دن تجھ کو اڑا دیں گے کہیں
مفت میں ناحق کٹا دیں گے کہیں
دل نے سُنکر کانپ کر کھا پیچ و تاب
غوطہ میں جاکر دیا کٹ کر جواب
رشتہ در گردنم انگندہ اوست
می برو ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

★

مرزا نے یہ نظم رام کلی کو بھیج دی۔ رام کلی نے اپنے استاد سے پتنگ کے داؤ پیچ سیکھ لیے اور بنت کے ساتھ گانے کی خوب مشق کر لی۔ ایک روز پتنگ بازی کا جلسہ ہوا اور رات کو دوستوں کی دعوت کا اہتمام بھی ہوا۔ دعوت میں شہر کی مشہور گانے والیوں کو بلایا گیا۔ بلوان نے خورشید جان کو دعوت دی اور مرزا نے رام کلی کو بلایا۔ کھانے کے بعد محفل جمی۔ پہلے دوسری طوائفوں نے مجرا کیا۔ پھر خورشید نے غزل سنائی اور آخر میں رام کلی نے مرزا کی یہ نظم غمزہ و ناز کے ساتھ پیش کی۔ ہر طرف سے واہ واہ کا شور اٹھتا رہا۔

رام کلی گا کر بیٹھ گئی تو ایک منچلے دوست نے کہا۔ بھئی آگرہ میں تو دو چیزیں رہ گئی ہیں۔ ایک مرزا نوشہ کا کلام دوسرے رام کلی کا نغمہ۔ شعر مرزا کے ہوں اور آواز رام کلی کی۔ باقی سب ایچ۔

اس تعریف پر خورشید جل بھن گئی۔ خورشید کے دل میں ایک بل اور پڑ گیا۔ خورشید نے اس محفل میں کچھ اس طرح ذکر چھیڑا جس سے مرزا اور رام کلی کے تعلقات کو اجاگر کیا گیا۔ رام کلی تو خوش تھی لیکن مرزا اپنے تئیں اس قسم کی شہرت کو مناسب نہ سمجھتے تھے۔ مرزا کے تیور دیکھ کر مرزا کے دوستوں نے بلوان سے کہا کہ اپنی چہیتی کو روکو دوستوں کی عام محفل میں ایسے تذکرے بھلے معلوم نہیں ہوتے۔ بلوان چالاک آدمی تھا۔ اس نے بات ہنسی میں ٹال دی اور کہا۔ دل لگی کی محفل ہے دل لگی کی باتیں ہو رہی ہیں۔ خدانخواستہ رخِ سخن کسی کی طرف تھوڑی ہے۔

آخر شب جلسہ برخواست ہوا۔

ایک شب مرزا رام کلی کے کوٹھے پر گئے ہوئے تھے کہ خورشید بھی جا پہنچی۔ مرزا چونکہ بغیر اطلاع کئے چلے گئے تھے اس لئے کسی نے ان کا استقبال نہ کیا۔ بلکہ کسی کو معلوم بھی نہ ہو سکا کہ مرزا بھی کمرے میں بیٹھے ہیں۔ خورشید نے کسی طور معلوم کر لیا تھا کہ مرزا جی آئے ہوئے ہیں۔ دوسرے ساتھ والے کمرے میں خورشید۔ رام کلی اور نائیکہ بیٹھی تھیں۔ خورشید کو سنہری موقعہ ہاتھ آیا۔ اس نے نائیکہ سے کہا۔

اے بُوا سُنا ہے مرزا جی یہاں بہت آنے جانے لگ گئے ہیں۔ عجیب ہرجائی ہیں وہ بھی پہلے ہمارے گھر بھی اسی طرح آتے تھے۔ بلکہ دن رات پڑے رہتے تھے۔ مجھے ان کی حرکتیں پسند نہ آئیں۔ بلوان جی کو بھی ان کا آنا جانا بھلا نہ لگا۔ بھلا یہ بلوان کا مقابلہ کریں گے۔ میں نے انہیں اپنے گھر سے چلتا کیا۔ رام کلی نے کہا۔ اچھا جی اگر مرزا ایسے ہی بُرے تھے تو پھر تم نے اس روز جلسہ میں مجھے مرزا کے ساتھ شرارت کرنے پر آمادہ کیوں کیا تھا۔ کیا اس بُرائی کو تم میرے ساتھ چپٹانا چاہتی تھیں؟ پھر تو تم ہماری ہمدرد نہ ہوئیں۔ میں تو مرزا کو جانتی بھی نہ تھی۔ تمہی نے مجھے ان سے بے تکلف کروایا ہے۔

خورشید نے کہا۔ تمہاری شکایت سر آنکھوں پر اسے میری غلطی سمجھو یا قصور۔ در اصل میں نے اس سیلاب بلا کو تمہارا دروازہ دکھانا

چاہا تھا۔ اگر میں یہ نہ کرتی۔ تو میں اس سے کیونکر پیچھا چھڑا سکتی تھی۔

اس روز مجھے ان کا بننا پسند نہ آیا۔ کیسے مکّار ہیں۔ شب و روز پیتے چلے آئے ہیں اور دوستوں کی محفل میں لگے یار پارسا بننے۔ کہا نا بھئی میں نہیں پیتا۔ اگر نہیں پیتے تھے۔ تو پھر میرے ہاتھ سے کیوں پی لی؟ جانتے تھے کہ خورشید دیرینہ ہمراز ہے۔ اس سے انکار کیوں نہ پڑے گا۔ لیکن تمہیں اپنے دام شرافت میں پھنسانے کے لئے جھوٹ تک بول گئے۔

رام کلی کو یاد آیا کہ خورشید ہی نے تو میری اماں کو مرزاجی کی باتیں سنا کر بدظن کیا تھا۔ رام کلی نے اس کا ذکر خورشید سے کیا تو چالاک عورت نے ہنسکر ٹال دیا۔ اور کہا۔ اری میری بلو یہ بڑی لمبی کہانی ہے۔ اس وقت تمہیں کیا سناؤں۔ پھر کبھی فرصت میں سُن لینا۔ اب جاؤ دوسرے کمرے میں تمہارے چہیتے مرزاجی تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ مرزاجی کی آمد کا سُن کر رام کلی حیران رہ گئی۔ نائیکہ نے کہا لیکن یہ بغیر اطلاع کے کیسے چلے آئے۔ خورشید نے طنز سے کہا۔ اے بُوا ...... عشق پر زور نہیں ..... رام کلی مرزا کے پاس چلی گئی۔ خورشید کو موقعہ ملا۔ اس نے نائیکہ کو بھڑکانا شروع کیا۔ اور کہا۔

کیا خوب۔ چار دن کے میل ملاپ سے تم نے رام کلی کو اسقدر آزادی دے دی ہے کہ مرزا کے ساتھ بے تکلف ہو گئی ہے۔ اور مرزا بھی اب کسی پیشگی اطلاع کی ضرورت محسوس نہیں کرتے ایسا تو وہ بھی نہیں کرتے جس سے سستی کی رسم ادا ہو جائے۔ یاد رکھو بُوا۔ وہ شکاری ہے۔ چار دن میں اس معصوم کو لوٹ مار کر اپنا راستہ لیگا۔ اور تم دیکھتی رہ جاؤ گی۔

ایسا بھی ممکن ہے کہ رام کلی عشق کے ہاتھوں مجبور ہو کر مرزا کے ساتھ چلنی بنے۔

نائیکہ نے کہا۔ خورشید جان بات تو تم ٹھیک کہتی ہو رام کلی پر میری تعلیم کا اثر ہے اور وہ ابھی سے بنا کیا۔ کمسن بھی ہے کسی اور بات کو کیا جانے۔ مرزا بھی اس کوچے میں نووارد ہیں۔ ابھی خط تک نہیں آیا۔ وہ عاشقی واشقی کیا جانے۔ رئیس زادے ہیں امیرانہ ٹھاٹھ سے شغل کرنے آتے ہیں چلے جاتے ہیں۔

خورشید نے کہا۔ اچھا تو اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں تمہیں دونوں کے دلوں کا بھید دکھا دوں اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا کہ وہ دونوں کیا ہیں اور کس راہ پر چل نکلے ہوئے ہیں۔

نائیکہ اس کی بات سن کر پریشان ہوئی اور اسے اجازت دیدی۔ خورشید نے شراب منگوائی۔ تین جام بھر کر جڑاؤ طشت میں لگا کر کمرے میں چلی گئی۔ خورشید نے بڑی عیاری سے ایک جام میں کچھ ملا دیا۔ کمرے میں جا کر مرزا کو سلام کیا اور شیشہ و جام سامنے رکھ دیئے۔ رام کلی نے کہا۔ مرزا جی یہاں پینے پلانے نہیں آتے۔ تم نے یہ تکلف کیوں کیا خورشید نے کہا۔ بھئی مرزا جی آپ کے مہمان ہیں۔ میں اتفاق سے یہاں موجود تھی۔ سہیلی کے مہمان کی تواضع میرے ذمہ ہے۔ میں نے کسی پر احسان تو کیا نہیں۔ پھر ایک جام مرزا کے حضور پیش کیا۔ دوسرا جام رام کلی کو دیا۔ اور تیسرا خود سنبھال کر بیٹھ گئی۔ مرزا نے مسکراتے ہوئے جام پی لیا۔ رام کلی نے بھی جام خالی کر دیا۔ خورشید بھی جام چڑھا گئی اور خالی شیشہ و جام اٹھا کر

دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

مرزا نشے میں گنگنانے لگے۔ رام کلی داد دینے لگی پھر آوازیں رُک گئیں۔ خورشید نے نائیکہ سے کہا۔ اب ذرا خبردار ہو کے دیکھو اندر کیا ہو رہا ہے۔ رام کلی مرزا کی آغوش میں ہے۔ اس کی ایک کلائی مرزا کی گردن میں حائل ہے اور مرزا کا ہاتھ اس کے سینے پر ہے۔ نائیکہ سے نہ رہا گیا۔ وہ بجلی کی طرح اندر چلی گئی۔ خورشید دروازے سے لگی رہی۔ رام کلی شرما کر الگ ہو گئی۔ مرزا کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے نائیکہ کی طرف دیکھا۔ نائیکہ بیٹی کو صلواتیں سنانے لگی۔ دوپٹہ میں منہ چھپائے روتی رہی۔ نائیکہ نے مرزا سے کہا۔ دیکھو جی رام کلی ایسی گئی گذری نہیں ہے کہ چار دن کوئی آئے اور اُس پر ہاتھ صاف کر کے چلتا بنے۔ ہمیں معاف کریں اور اپنا ٹھکانہ کہیں اور بنائیں۔ رام کلی دوسرے کی پابند ہو چکی ہے۔ اور دو چار روز میں اس کی رسم ہونے والی ہے۔ مرزا پر بُری طرح مستی طاری تھی انہیں اپنی حالت خود سمجھ میں نہ آ رہی تھی۔ نائیکہ کی گفتگو وہ اچھی طرح نہ سمجھ سکے صرف اتنا سمجھے کہ انہیں چلے جانے کے لئے کہہ رہی ہے کیونکہ نائیکہ نے اپنا ہاتھ ماتھے پر رکھا اور سلام کیا۔ رام کلی کے استاد نے مرزا کو سہارا دیا اور باہر جا کر سواری میں بٹھا دیا اور اپنے گھر پہنچ گئے۔ یار دوست انتظار کر رہے تھے۔ حیران تھے کہ بغیر بتائے مرزا جی کہاں چلے گئے۔ وہ آئے تو گھر کے ملازموں نے گاڑی سے اُتارا۔ ملازم سہم گئے۔ آخر یہ بات مرزا کی والدہ تک پہنچ گئی۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ جب مرزا کو ہوش آیا

تو بے اختیار شعر کہا۔

ؔ مجھ تک کب اس کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

★

قیدِ حیات و بندِ غم

۱۸۱۵ء کا زمانہ تھا۔ مرزا اپنی عمر کی تیرہ منزلیں طے کر چکے تھے۔ اور چودہویں میں قدم رکھا تھا۔ مرزا کی والدہ عزت النساء بیگم کو مرزا کی آوارگی سے گہری تشویش پیدا ہو چکی تھی، وہ سمجھدار ماں تھی۔ بیٹے کو روبرو کر کے اُس کی مؤدب نگاہوں کو گستاخ کرنے کی بجائے در پردہ بیٹے کی اصلاح کی تدبیریں سوچ رہی تھی۔ آخر فیصلہ کیا کہ مرزا کو شادی کی زنجیروں میں باندھ دیا جائے۔ بہت ممکن ہے کہ گھر گرہستی کی زندگی سے مانوس ہو کر باہر کی آوارہ زندگی سے گریز کر جائے۔ مرزا کی بڑی بہن چھوٹی خانم کی شادی چند ماہ قبل مرزا اکبر بیگ بدخشی سے ہو چکی تھی۔ لہٰذا اس نے بھی ماں کو یہی مشورہ دیا کہ بھیا کی جلد از جلد شادی کر دی جائے۔

ایک روز عزت النساء بیگم بوڑھی خواتین کے ساتھ سر جوڑے بیٹھی کچھ گہرے راز کی باتیں کرنے میں مصروف تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی اہم خاندانی مسئلہ درپیش ہے۔ مغلانی خاصدان میں پان بناتی اور خادمہ وفادار ان اِن

کے سامنے لا کے رکھ دیتی۔ سب عورتیں گلوری منہ میں رکھے رازدارانہ گفتگو کئے جا رہی تھیں۔ بار بار ان کی زبان پر حاجی یا حاجی خان کا نام آ رہا تھا۔ گویا انہیں خاندان کے اس بزرگ کا بھی انتظار تھا۔ کبھی کبھی نواب الٰہی بخش خاں معروف کا بھی ذکر آجاتا تھا۔

ایک معمر عورت نے کہا۔ میں نے تو حاجی کی زبانی بارہا سنا تھا کہ مرزا نوشہ کا چلن کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ یہ سن کر ہول کھاتی تھی۔

دوسری عورت نے کہا۔ اے بی۔ اللہ کو جان دینی ہے۔ بھائی حاجی تو سر پیٹتے تھے کہ خاندان میں اب کوئی مرد سرپرست نہیں رہا۔ بی عزت محل سرائے کے پردوں میں بیٹھی بچوں کی نگرانی کیسے کر سکتی ہیں۔ وہ تو ان بچوں کی طرف سے ہمیشہ پریشان رہتے تھے۔ اور جائداد کی دیکھ بھال کرنا چاہتے تھے۔ رنڈیوں کے کوٹھے پر دولت لٹنے کی باتیں سننے تو پہروں روتے رہتے۔

تیسری عورت نے کہا۔ ہاں بہن حاجی خاں کو واقعی ان کی بہت فکر رہتی ہے۔ اور یہ فکر ہی وہ بات تھی جو اس نے خاندان کی مخالفت کے باوجود اتنی دوڑ دھوپ کر کے چھوٹی خانم کا رشتہ اکبر خاں بدخشی سے کرا دیا ورنہ گھن تھا۔ جو جوان بیٹی کے خیال کو گلے لگائے بیقرار رہتا۔ اللہ کا کرم ہے وہ اپنے گھر میں بہت خوش ہے۔ اس کا سہاگ بنا رہے۔

ایک معمر عورت نے پان لیتے ہوئے کہا۔ خدا لگتی کہی تم نے بی۔ حاجی نا، تو شروع سے ساری جاگیر سنبھالنے کے لئے فکرمند تھا۔ اسے ہی

ڈر تھا کہ یہ نادان بچے دولت لٹا کر ہاتھ جھاڑ کے کھڑے ہو جائیں گے ماں بے چاری تنہا رنڈاپے کے دکھ جھیلے۔ گھر سنبھالے۔ بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھے۔ بچوں کی پرورش کرے جائداد کا حساب کرے دیکھے۔ کیا کیا جتن کرے؟

ایک دوسری عورت نے کہا۔ بھائی حاجی کی کوئی نہ سنے کوئی نہ مانے تو اس کا کیا علاج۔ خاندان کے بدخواہوں نے بھائیوں کو الگ الگ کرنے کے جتن کئے مگر کہیں لاٹھی مارے پانی جُدا ہو دے؟

عزت النسا بیگم ان سب کی باتیں سن رہی تھی خاموش تھی کبھی کبھی کسی کی بات کی سر ہلا کر تائید کر دیتی تھی۔ اتنے میں مغلانی نے آکر اطلاع دی۔ کہ داروغہ جی کہتے ہیں کہ خواجہ صاحب آئے ہیں۔ (خواجہ صاحب سے مراد حاجی خان تھے) یہ سن کر ایک بڑھیا نے عزت سے کہا۔ بہو بیگم تم اندر چلی جاؤ۔ ہم حاجی کو یہاں بلا لیتے ہیں۔ اور جس جس کا پردہ ہے۔ وہ بھی عزت کے ساتھ اندر چلی جائے عزت النسا نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اللہ کرے خوشی کی خبر لایا ہو۔ جب پردہ ہو گیا تو حاجی صاحب محل سرائے کے اندر بلائے گئے۔ سلام و دعا کے بعد سلسلہ کلام جاری ہوا۔ حاجی خان نے کہا۔ میری طرف سے عزت بہن کو مبارک باد دو کہ نوشہ میاں کو اللہ نے چاند سی دلہن اور نواب خاندان میں سسرال دی ہے۔

ایک عورت بولی۔ اس میں کیا شبہ ہے۔ نواب الٰہی بخش خاں پشتی رئیس اور خاندانی نواب ہیں۔ بڑے بڑے رئیس اس کی بیٹی کے لئے پیام دینے کی آرزو کرتے ہیں۔

ایک ضعیف عورت نے اندر جا کر عزت کو مبارک باد دی اور کہا کہ اب با اگلے ماہ شادی ہو جائے۔۔ عزت نے مسکرا کر کہا۔ حاجی بھائی کا شکریہ۔ میں تو دو نفل شکرانے کے ادا کروں گی۔

ادھر یہ بندھن سوچے جا رہے تھے۔ ادھر مرزا نوشہ طوائفوں کی محبت میں بے قرار ہوئے جا رہے تھے۔ اس روز مرزا نوشہ تو رام کلی کے گھر سے چلے آئے تھے۔ اور دوستوں میں دل بہلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن رام کلی پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ مرزا کے وہاں سے چلے جانے کے بعد نائیکہ نے رام کلی کو بہت سخت سُست کہا اور طعن دیتے ہوئے کہا۔

کیوں ری۔ شریفوں کو یار بنا کے رکھے گی۔ ابھی تو کسی عمر کو تو پہنچ لے۔ ہم اس عمر میں کسی سے ہنس کر بات نہیں کر سکتے تھے۔ کل کی چھوکری کو عشق بازی سوجھی ہے۔ محبت کی پینگیں بڑھا رہی ہے۔ لو اور سنو۔ سکھائیں کچھ اور کرے کچھ۔ ذرا سی ڈھیل دی ہے دو باتیں کرنے کے لئے تنہا چھوڑ دیا۔ اور تو اسے اپنا یار جان بیٹھی۔ اب دیکھوں وہ مرزا یہاں کیسے قدم رکھتا ہے اور پھر تجھ کو مجرے پر کیونکر بُلاتا ہے۔ تجھے یہ خبر نہیں ہے کہ یہ رئیس زادے نوجوان بھونرے بن کر بُو باس اور رنگ روپ تاکتے پھرتے ہیں۔ جہاں موقع ملا رس چوسا اور اُڑتے بنے۔

رام کلی سے نہ رہا گیا۔ تو جواب دیا۔ اے اماں چُپ بھی ہو جاؤ۔ ان بے چاروں کا کیا قصور تم نے خود دولت کو تاک کر انھیں دعوت دی۔ وہ چلے آئے۔ نائیکہ نے تلملا کر کہا۔ افو۔

ع :-
دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی

یہ کہو کہ بُری طرح پھنسایا ہے۔ مرزا نے تمہیں۔ اے لوآئی طرفدار اس کی جو ساری دُنیا میں بدنام ہے۔ اس مشہور تماش بین کو کون نہیں جانتا۔ اپنے دیوانخانے میں دن رات چوسر گنجفہ پر بازیاں کھیلتا ہے الماریوں میں شراب کی بوتلیں بھری رہتی ہیں۔ آگرہ کی کون سی رنڈی ہے جو اس کے دیوان خانے میں حاضر نہیں ہوئی ہو۔ اور جس نے ذرا تامل کیا اشرفیوں کی تھیلیاں جیب میں ڈالیں اور خود وہاں چلا گیا۔ جب جی بھر گیا پھر دوسرے دروازے کا ہو لیا۔ ذرا غور سے سُن لو میرے گھر میں کوئی لفنگا عشق و عاشقی کا جال نہ بچھا سکے گا۔ رام وتی ہے میرا نام۔ بڑے بڑے رئیسوں کو ٹھکانے لگا دیا ہے۔ میں نے کہا کوئی امیر ہوگا تو اپنے گھر کا اپنی امیری کو بھاڑ میں ڈالے۔

غرض وہ اس طرح اول فول بکتی رہی۔ اور رام کلی چپکے چپکے روتی رہی اب وہ مجبور و بے بس ہو کر قیدی کی طرح زندگی گذارنے لگی ادھر مرزا نوشہ اس کی جدائی میں بیتاب تھے اور دونوں ایک دوسرے کے حال سے بے خبر تھے دونوں اپنی جگہ آتشِ ہجر میں جلنے لگے۔ رام کلی مرزا کو دل سے چاہتی تھی۔ مرزا کو اس کے قریبی دوستوں نے رنڈیوں کے رنڈی پن سے ڈرایا۔ وہ سمجھ گئے کہ رام کلی بھی ایک رنڈی ہے۔ رنڈی کی بیٹی ہے اُسے کوئی اور دولت مند مل گیا ہوگا اور نائیکہ نے سودا کر لیا ہوگا۔ میر ادر حنان نے مرزا سے کہا کہ آپ رام کلی کو اپنے ہاں مجرا کے لئے بُلایئے۔ تو دو اس کے

کو بٹھے نہ جائیے اس میں خاندانی وقار قائم رہے گا اور اُس کا امتحان بھی ہو جائے گا۔ نہ آنا ہو گا تو ہزار بہانے ہیں آنا چاہے گی تو اُسے کوئی روک نہیں سکتا۔ مرزا کو دوستوں کی یہ تجویز پسند آئی اور رام کلی کو مجرا کے لئے پیغام بھیجا۔ نائیکہ نے صاف جواب بھیجدیا کہ ہم معافی چاہتے ہیں۔ اب مرزا کو یقین آگیا کہ رام کلی اپنی ماں کے ہاتھ میں ہے۔ چنانچہ مرزا کے دل میں رام کلی کی طرف سے فرق آگیا۔ اب مرزا نے رام کلی اور خورشید دونوں سے دھیان ہٹا لیا اور دوسری طوائفوں کو مجرا کے لئے بلاتے لگے۔ چنانچہ پھر عیش و طرب کے ہنگامے جاری ہوئے مرزا کو مے نوشی کا چسکا لگ چکا تھا۔ اب وہ چوٹ کھائے ہوئے دل کو بہلانے کے لئے اس لال پری کو سینے سے لگائے رہتے۔ جب دوستوں نے کثرت مے نوشی سے روکا تو مرزا نے کہا ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس رُو سیاہ کو
اِک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

بار پرہیزی ہو ہی چکی تھی اور کھلے طور محفل میں دورِ جام ہونے لگا۔ رفتہ رفتہ مرزا صاحب اس کے عادی ہو گئے۔ مرزا چاہتے تھے کہ دل سے رام کلی کا خیال ہٹ جائے اور جب اس پری چہرہ کا خیال زیادہ ستاتا تو یہ شعر پڑھ لیتے ؎

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

ایک بار میر نے رام کلی کا ذکر چھیڑ کر مرزا سے پوچھا۔ بھلا آپ کو اس کوچہ سے کیا ملا تھا؟

مرزا نے برجستہ جواب دیا ؎

جراحت تحفہ الماس ارمغاں داغِ جگر ہدیہ
مبارکباد اسدؔ غمخوارِ جانِ دردمند آیا!

خان نے کہا۔ مرزا جی اگر ہم یار دوست روک ٹوک نہ کرتے۔ تو خدا معلوم آپ کہیں سے کہیں پہنچ چکے ہوتے۔ مرزا نے ذرا طنز سے مسکرا کر کہا ہاں بھئی آپ سب کا ممنون ہوں۔ مگر تم یہی سمجھو ؎

شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
اس سے یہ کوئی پوچھے اس نے کیا مزا پایا

بنسی نے کہا۔ مانا وہ بازار کی مٹھائی حسن و جمال میں بے مثال ہے لیکن اس کے کوچے کی خاک چھاننا آپ کی شان کے خلاف تھا۔ ان کی گلی کا گز تو وہ بنے جس کی جیب خالی ہو اور ادھار پر مزے لینا چاہے۔
مرزا نے کہا۔ ہاں بنسی یار ہم نے واقعی غلطی کی۔

؎

دل دیا جان کے کیوں اس کو وفادار اسدؔ
غلطی کی کہ جو کافر کو مسلمان سمجھا!

★

ایک روز عزت النسار بیگم نے خواجہ حاجی خان کو بلا بھیجا۔ حاجی خاں دراصل مرزا نوشہ کے خاندان سے دُور کا واسطہ تو رکھتے تھے مگر دونوں کے سلسلہ نسب جُدا تھے۔ خواجہ حاجی کے والد خواجہ قطب الدین خاں مرزا نوشہ کے دادا مرزا ترسم بیگ خان کے ساتھ ترکستان سے ہجرت کر کے ہندوستان چلے آئے تھے۔ اور وہ مرزا کے مورث اعلیٰ کے بھائی رستم خاں کی اولاد میں سے بتلائے جاتے تھے مرزا نوشہ کے خسر نواب الٰہی بخش خان معروف ان کے بھائی نواب احمد بخش خان کی ہمشیرہ مرزا نوشہ کے چچا مرزا نصراللہ بیگ خان سے بیاہی ہوئی تھی۔ اور خواجہ حاجی خان اپنے آپ کو نواب احمد بخش خان سے ملاتے تھے۔ اور انہیں اپنے رشتہ کا بھائی بتاتے تھے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط تھا۔ دراصل جائداد کے حصول کی غرض سے ان کا یہ خاندانی رشتہ خود ساختہ تھا۔ درحقیقت حاجی خان کے والد مرزا کے دادا کے خادم کی حیثیت رکھتے تھے لیکن بعد میں حاجی نے وثیقہ میں شریک جائداد ہونے کے لئے اپنا شجرہ نسب ملانے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ اس واسطے حاجی خان نے مرزا کے خاندان سے قرابت داری کا ڈھونگ رچا کر ان کی سرپرستی شروع کر دی۔

عزت النسار بیگم کو گھریلو معاملات کے سلجھانے کے لئے کسی ہمدرد مرد کی ضرورت تھی۔ حاجی خان نے اس کی اس ضرورت اور کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور انہیں مشورہ دیا کہ مرزا کی شادی نواب خاندان میں کر دی جائے۔ اور عزت و وقار قائم رہیں گے۔ حاجی خان نے چھوٹی خانم کا رشتہ اپنے

سلسلے اکبر بیگ خان بدخشی سے کروادیا تھا۔ اب مرزا نوشہ کا رشتہ نواب الٰہی بخش خان موصوف کی صاحبزادی امراؤ بیگم سے کروادیا تھا۔ بیگم عزت نے حاجی خان سے کہا کہ جائداد کا کچھ حصّہ رہن رکھکر شادی کے لیے روپیہ حاصل کریں۔ حاجی خان اسی وقت کا منتظر تھا۔ چنانچہ اُس نے مرزا کی خاصی جائیداد رہن اور فروخت کر کے اس میں سے تہائی جائیداد داب لی۔ چھوٹی خانم کے خسُر یعنی اکبر خاں بدخشی کے والد مرزا جیون بیگ خاں بھی حاجی خان کے ساتھ تھے۔ بیاہ کے سامان کی خرید شروع ہوئی شاہانہ زیورات خریدے اور بنوائے گئے امیرانہ ٹھاٹھ سے بارات اُٹھی اور بڑے تزک و احتشام کے ساتھ نواب الٰہی بخش کے گھر... ... دہلی پہونچی۔ دہلی میں کئی روز محفلِ نشاط و طرب برپا رہی اور دونوں خاندانوں کی روایات کے مطابق بڑی شان و شوکت سے تمام رسوم ادا ہوئیں۔ مردانہ محفل میں مشہور نامور طوائفوں اور نقالوں کے طائفے اور زنانخانے میں ڈو ڈومنیاں اپنے فن کا کمال دکھا رہی تھیں۔ یہ رنگارنگ کی محفلیں کئی روز رہیں۔ دہلی کے نامور لوگوں میں مرزا نوشہ کا تعارف ہوا اور وہاں سے مشہور شعرا میں اسدؔ کا چرچا رہا۔ شاعر لوگ آئے اور ایک جواں سال شاعر سے ملے اور دتی کی محفلوں میں مشاعرۂ کی دعوتیں دی گئیں۔ موقعہ ملتا تو مرزا سے اُن کا کلام بھی سُن لیتے اور داد دیتے۔ کہتے سبحان اللہ یہ عمر اور سخن فہمی میں یہ عروج۔ آگرہ سے بھی بارات کے ساتھ کئی طوائفیں اور ڈومنیاں دہلی آئی تھیں۔ ان میں الٰہی جان

ڈومنی بھی تھی۔ جس نے مرزا کا سہرہ پڑھا تھا۔ اس کی عمر سولہ برس کے قریب ہوگی اور وہ مرزا کے مردانہ حسن وجمال پر دل وجان سے فریفتہ ہو چکی تھی۔ لیکن محبت کا راز سینے میں چھپائے ہوئے تھی۔ بارات کا جلوس گھوڑا گاڑیوں۔ بیل گاڑیوں اور اونٹ گاڑیوں کی شکل میں آگرہ سے دہلی پہنچا تھا۔ راستہ بھر بزم رقص ونغمہ جاری رہی۔ دہلی میں خانۂ عروس کا تو جواب ہی کیا تھا۔ نواب صاحب دہلی کے خاندانی رئیس تھے۔ وہاں کیا کمی تھی۔ ان کی بڑی صاحبزادی بنیادی بیگم کی شادی نواب غلام حسین خاں مسرور سے ہو چکی تھی۔ اب چھوٹی صاحبزادی امراؤ بیگم جس کی عمر صرف گیارہ برس کی تھی کی شادی مرزا نوشہ سے ہو رہی تھی۔ مسرور بہت مسرور تھے کہ ان کا ہم زلف مشہور شاعر ہے اور آگرہ کا رئیس زادہ بھی ہے۔

نواب الٰہی بخش کا گھرانہ دور دور مشہور تھا۔ اور دلی کے عمائدین اور اربابِ علم وادب سب ہی ان کے حلقۂ احباب میں شریک تھے۔ یہ تمام دوست احباب اس شادی میں شریک ہوئے اور مرزا نوشہ سے ان کا تعارف ہوا۔ آگرہ کی گانے والیوں نے مرزا کی کئی غزلیں گائیں۔ اس طرح اہل دہلی مرزا کے کلام اور علم وفضل سے متعارف ہوئے۔ ۸ر اگست ۱۸۱۰ء کو دہلی سے بارات رخصت ہوئی۔ عزت بیگم بڑی خوش تھیں۔ کہ ننھی سی چاند جیسی دلہن بہو بن کر گھر میں آئی ہے۔ اُدھر نواب الٰہی بخش خاں کو داماد کے خاندانی وقار اور فضل وکمال پر بڑا فخر تھا۔ لیکن مرزا کے دل کا حال کسی کو معلوم نہ تھا۔ اب ان کی زندگی ہنگامہ کتنا کش

بن گئی تھی۔ وہ رام کلی کو چاہتے تھے اور الٰہی جان ڈومنی مرزا پر مرچکی تھی۔ اس حیاتِ رنگین کا اپنے ہاتھوں جنازہ اٹھانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ مرزا کے سامنے اسد کے ارمانوں کی بے گوروکفن لاش پڑی تھی اور زنانخانہ میں شادی کے ہنگامے قہقہے لگا رہے تھے۔

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحہ غم ہی سہی نغمہ شادی نہ سہی

اس ہنگامے سے آنکھ بچا کر الٰہی جان مرزا کے پاس آئی۔ شادی کی مبارک دی اور پوچھا فرمائیے مرزا صاحب حضور نے باندی کا سہرا سُنا تھا۔ پسند بھی فرمایا حضور نے۔ مرزا نے کہا۔ کیوں نہیں۔ سہرا خوب تھا۔ اور جس انداز سے پڑھا گیا۔ اس کا تو جواب ہی نہیں! الٰہی جان نے کہا۔ کسی نے خونِ جگر سے لکھا تھا۔ مرزا نے حیرت سے پوچھا۔ کیا تم بھی شعر کہتی ہو؟ الٰہی جان نے آنکھیں جھکا لیں اور عرض کیا۔ یہ سب حضور کے کوچے کی خیرات ہے۔ ورنہ میں کہاں اور یہ ذوق کہاں۔ پھر الٰہی جان نے جذبہ دل پر قابو پاتے ہوئے ہنس کر کہا۔ چشم بد دُور آج تو آپ ماشاءاللہ بہت ہی .... اس سے آگے کہتی کہتی رک گئی۔ اور مرزا نے اپنے دل میں کہا ؂

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پہ رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

★

تنگدستی اگر نہ ہو غالب

زمانہ بدل رہا تھا۔ وقت کروٹیں لے رہا تھا۔ ہندوستان پر اُنیسویں صدی کے آغاز سے جو بیرونی یورشیں شروع ہوئی تھیں اور سلطنت مغلیہ کی بنیادوں کو متنزلزل کرنے میں مصروف تھیں۔ ان کے اثرات لمحہ بہ لمحہ بڑھتے جا رہے تھے۔ مرہٹوں اور سکھوں کی سازشوں نے حکومت کے زوال کے سامان مہیا کر دیئے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی برطانوی تسلط جمانے کی تدبیریں کر رہی تھی ان وجوہات سے مغلیہ اقتدار کو صدمہ پہونچ رہا تھا۔ برطانوی ایجنٹوں کا بڑا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے ایک ہزار برس کے اقتدار کو کمزور کر کے ختم کر دیا جائے تاکہ ہندوستان پر مکمل طور پر برطانوی حکومت کا تسلّط قائم ہو سکے۔ چنانچہ بنگال اور دکن میں ان کی سازشیں کامیاب ہو چکی تھیں۔ اور کمپنی کی پوزیشن مستحکم ہو چکی تھی۔ مغلیہ سلطنت کی شمع جھلملا رہی تھی۔

جس زمانے میں مرزا غالب آغوشِ پدری سے محروم ہوئے اُسوقت

ان کی عمر صرف پانچ برس کی تھی اور انگریزوں نے مرہٹوں کا خاتمہ کر کے دہلی پر اپنی فتح کا جھنڈا لہرایا تھا۔ تیموری حکمران شاہ عالم ثانی نابینا تھے انہوں نے معذوری و مجبوری کی حالت میں برطانوی اقتدار کو تسلیم کیا اور لال قلعہ کی چار دیواری میں اپنے نام کی حکمرانی رکھنا غنیمت سمجھا۔ ۱۸۰۶ء میں جب مرزا نصر اللہ بیگ خان اچانک ہاتھی سے گر کر انتقال کر گئے تو اس وقت مرزا کی عمر صرف نو برس کی تھی۔ اس سال شاہ عالم ثانی نے وفات پائی اور اکبر شاہ ثانی مسند نشین ہوئے۔ ملک کے معاشرتی اور اقتصادی حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔

مرزا غالب کے خاندانی حالات سدھرنے کی بجائے بگڑتے چلے جا رہے تھے۔ خاندان کا کوئی مرد سرپرست نہ رہا تھا۔ آمدنی کے ذرائع رفتہ رفتہ سمٹتے چلے جا رہے تھے۔ مرزا فطری طور پر انتہا پسند۔ خود دار۔ فیاض طبع اور خرچالو تھے۔ ۱۸۱۰ء میں پہلے چھوٹی خانم کی شادی ہوئی تو اُس وقت جائداد فروخت کرنی پڑی پھر چند ماہ بعد مرزا نوشہ کی شادی کا اہتمام ہوا۔ تو رہی سہی جائداد رہن رکھ دی گئی۔ باقی جو رہ گئی۔ اس سے صرف گذر اوقات ہو رہی تھی۔ مرزا نصر اللہ بیگ خاں کی وفات پر ان کی تنخواہ بند ہو چکی تھی۔ سونکھ اور سونسا کے پرگنے انگریزوں نے واپس لے لئے تھے۔ اور صرف دس ہزار روپیہ سالانہ کی پنشن مقرر کر دی تھی۔ جس میں یہ دونوں خاندان گذارہ کرتے تھے۔

انگریز سرکار نے نصر اللہ بیگ کے ورثار کی پنشن کو ان کے سالے

نواب احمد بخش خان کی ریاست سے منتقل کرکے نواب صاحب کو مختار کل بنا دیا۔ چنانچہ ابتدا میں نواب صاحب نے اس رقم کی تقسیم اس طرح کی کہ نصراللہ مرحوم کے خاندان کو پانچ ہزار روپیہ سالانہ اور عبداللہ بیگ خاں کے خاندان کو پانچ ہزار روپیہ سالانہ ملنے لگا۔ یہ پنشن بھی کچھ ہی عرصہ جاری رہی۔ مرزا نوشہ کی تنہائی کی جائداد ابھی باقی تھی۔ اس کی آمدنی سے مرزا کے گھر کا گذارہ چل رہا تھا۔ بعد میں نواب احمد بخش خاں کی نیت بدل گئی۔ پانچ ہزار کی جگہ ڈھائی ہزار روپیہ سالانہ رقم ملتی تھی اس سے دونوں خاندانوں کو تکلیف پہونچی۔ کچھ عرصہ کے بعد نواب نے حاجی خان کو پنشن میں شریک بنا دیا۔ حالانکہ یہ بہت بڑی زیادتی تھی۔ لیکن نواب نے اپنے اختیاراتِ کلی سے فائدہ اٹھایا۔ اب دو ہزار سالانہ حاجی خان کو ملنے لگے۔ اور پندرہ پندرہ سو اُن خاندانوں کو ملنے لگا۔ مرزا کی زندگی میں تنگ دستی کا عالم نمودار ہوا۔

ادھر بلوان اور خورشید کے درمیان جھگڑا اُٹھا۔ خورشید نے اُسے طعن دیا کہ تم بڑے بے وفا نکلے ہو۔ حالانکہ میں نے تمہاری خاطر اپنا دل توڑ لیا۔ سینے پر پتھر رکھ لیا۔ مجھے مرزا سے بے پناہ محبّت تھی اور وہ صرف تمہارے تعلق کی بنا، پر مجھے منہ لگانے سے گریز کرتے تھے۔ اس بات سے مایوس ہو کر میں نے مرزا اور رام کلی کے درمیان جدائی کرا کے ان کے دل بھی توڑے اور بہت بڑا گناہ اپنے اوپر لے لیا۔ نہ مرزا گناہگار تھے نہ رام کلی خطاوار تھی۔ بس دونوں ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ لیکن

مجھے یہ پسند نہ تھا کہ میرے مرزاجی رقیب کی نگاہ محبت سے دیکھے جائیں۔

ع

تکلیف برطرف نظارگی میں بھی سہی لیکن !!!
وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھسے

اب بلوان کی آنکھیں کھل گئیں۔ اتفاق سے نائیکہ بھی وہاں موجود تھی۔ اس نے خورشید کی زبان سے ساری کہانی سُن لی اور سُن کر چلی گئی۔ ادھر بلدان نے مرزا سے جا کر معافی مانگی۔ چنانچہ غلط فہمی دُور ہو جانے سے دونوں دوست پھر مل گئے۔ رام کلی کی ماں نے بھی مرزا کے پاس آکر تلافی مافات کی کوشش کی اور رام کلی نے بھی ماں کا اشارہ پاکر مرزا کے سامنے آنسو بہا کر اپنی مجبوریوں کا اظہار کیا۔ نائیکہ نے مرزا کے پاؤں پکڑ کر عرض کیا۔ کہ گناہ گار میں ہوں مجھے سزا دے لیں۔ یہ معصوم بچی بالکل بے گناہ ہے اسے سزا نہ دیں اور معاف فرما دیں۔

مرزا نے ایک نظر اپنے دوستوں پر ڈالی۔ اور ان کے ارادوں کا جائزہ لیا اور کہا ؎

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موجِ بوئے گُل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

★

نائیکہ نے کہا مرزاجی اس ننھی سی جان کا کیا بنے گا؟ یہ تو آپ

کی محبت میں پاگل ہو جائے گی۔ قریب ہی بنسی دھر بیٹھے تھے۔ مرزا کا اشارہ پاکر کہا۔ مرزا جی آپ کا شعر خوب وقت یاد آیا ؎

؎

بُلبُل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گُل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

یہ سُن کر دوسرے دوست ہنس دیئے تو مرزا بھی کھُل کر مسکرا دیئے۔ نائیکہ سمجھ گئی کہ ان تلوں میں تیل نہیں ہے۔ وہ آہ بھر کر اٹھی اور رام کلی کا ہاتھ تھام کر اُسے بھی اُٹھا لیا اور کہا۔ چل بدنصیب میں تمہیں ہزار سمجھاتی تھی کہ دل لگانا ہمارا شیوہ نہیں ہے۔ رئیس لوگ جب چاہیں ہم لوگوں کے ہاں چلے آئیں کوئی روک ٹوک نہیں اور ہم بلانے پر بھی بے تکلف نہیں ہو سکتے کہ ہماری حدود ہمیں تجاوز کی اجازت نہیں دیتیں۔ دل لگا لگا کر توڑنا رئیس لوگوں کا مشغلہ ہے۔ لیکن ہمارے لئے یہ جُرم ہے۔ رام کلی نے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور کہا۔ اچھا سلام مرزا جی۔ مرزا جی نے داروغہ کو آواز دیکر کہا۔ انہیں انعام عطا فرما دو۔ رام کلی نے کہا۔ بس رہنے دیجئے۔ میں یہاں بکنے نہیں آئی تھی۔ یہ کہکر ماں بیٹی واپس چلی گئیں۔ داروغہ کا دل مارے خوشی کے اچھل رہا تھا۔ وہ چپکے سے زنانخانہ میں گیا اور بڑی بیگم سے رازدارانہ عرض کیا۔ کہ مُبارک ہو۔ ایک بلا آئی تھی۔ مرزا نوشہ نے دھتکار دیا ہے۔ اب عمر بھر وہ ادھر کا راستہ نہیں لے گی۔ بڑی بیگم نے پوچھا؟ کون آئی تھی۔

داروغہ نے عرض کیا۔ وہ نگوڑی رام کلی اور اللہ ماری اس کی ماں بیگم نے پوچھا؟ کیا ماں بیٹی دونوں آئی تھیں۔ داروغہ نے عرض کیا ہاں حضور ماں بیٹی کی انگلی پکڑ کر گھر دکھانے آئی تھی۔ بیگم نے حیرت سے کہا۔ توبہ ہے الہٰی توبہ ہے۔ ماں اپنی بیٹی کو گھر دکھانے آئی تھی۔ قہر خدا ٹوٹے اُن پر۔

اب مرزا نوشہ شہر کی عام محفلوں میں کم شرکت کرنے لگے۔ ان کی تمام تفریحات اور عیش و انبساط کے چرچے سمٹ کر بزم خاص تک محدود ہو کر رہ گئے۔ شہر میں شعر و سخن کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں۔ لیکن اصرار کے باوجود مرزا صاحب ان میں بہت کم شرکت کرتے۔ چند مخصوص احباب کی بزم مشاعرہ میں شریک ہو جاتے یا پھر اپنے دیوان خانے میں بزم آرائی کرتے۔

مرزا نوشہ کمسن خوش جمال تو تھے ہی۔ خوش گلو بھی غضب کے تھے یہ مست شعر و شباب اپنی بذلہ سنجی اور ظرافت و شگفتہ مزاجی کی وجہ سے احباب کے لئے جانِ محفل تھے۔ جب ترنم سے غزل پڑھتے محفل پر ایک جادو کر دیتے۔ ان کی بزم بہارستان بنی ہوئی تھی۔ اگرچہ مرزا کا عہد طفلی عیش و عشرت میں گذر رہا تھا۔ لیکن تحصیل علم و فن میں کوتاہی نہیں تھی۔ تفریحی مشغلوں کے ساتھ ساتھ وہ پوری توجہ اور دلی لگاؤ کے ساتھ شعر و ادب میں کمال حاصل کر رہے تھے۔ مرزا کا کلام ابتدا ہی سے عام ڈگر سے ہٹا ہوا۔ اور فطری انفرادیت کا نمونہ تھا۔

غالباً یہی وجہ تھی کہ اس زمانے کے عام لوگ مرزا کے کلام کو کچھ زیادہ پسند نہیں کرتے تھے۔ اور شاید مرزا کے عام مشاعروں میں شریک نہ ہونے کا ایک سبب یہ بھی تھا۔

اب مرزا نوشہ اپنی کمسن شریکِ حیات کے ساتھ قدرے پابند نظر آنے لگے۔ بیگم نے میکہ میں شہزادیوں جیسی زندگی بسر کی تھی ابھی اس کے سہیلوں کے ساتھ گڑیوں کا بیاہ رچانے کے دن تھے کہ وہ خود بیاہی گئی۔ کم عمری کی شادی میاں بیوی کے لئے بڑے لطف کی زندگی کا سبب ہوتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کے گلے کا ہار بنے رہتے ہیں۔ لیکن مرزا کے ہاں معاملہ اس کے خلاف تھا۔ نوعمر امراؤ بیگم محسوس کر رہی ہیں۔ جیسے کسی کھلی ہوا میں اڑتی چڑیا کو پنجرے میں ڈال دیا گیا ہو۔ مرزا زیادہ تر دیوان خانے میں رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ان کی والدہ کو ان کی یہ روش ناگوار گذرتی ہے۔ وہ مرزا کو دلہن کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرتی رہتی ہیں اور سمجھاتی رہتی ہیں کہ اب دن بھر باہر رہنا اور رات گئے تک کھیل تفریح میں وقت گذارنا ہرگز مناسب نہیں ہے۔ مگر مرزا کو یہ نصیحت کی باتیں سخت ناگوار گذرتی ہیں۔ ابتداء میں تو دلہن چوتھی چالے کی غرض سے میکے جاتی رہیں۔ ان کے ساتھ مرزا کو بھی رسم کے طور پر دلی جانا پڑا۔

لیکن اب مرزا اس آنے جانے سے بھی تنگ نظر آتے ہیں اگرچہ مرزا کے خسر اور خوش دامن داماد مرزا کو بہت چاہتے ہیں اور سسرال میں ان کی بڑی آؤ بھگت ہوتی ہے۔ لیکن مرزا کو اپنے دیوان خانے کی

جدائی شاق گذرتی ہے۔ اگرچہ سسرال میں سالی اور سالے مرزا کی آمد پر بچھے جاتے ہیں۔ لیکن مرزا کو یہ مدارات پسند نہیں آتیں۔ گو ظاہر میں کج خلقی کا برتاؤ نہیں کرتے اور ان کا بے حد احترام کرتے ہیں۔ لیکن یہ سب بہ جبرو کراہ ہے صرف نبھانے کی کوشش ہے۔ اور کچھ نہیں۔ وہ اپنی اس نئی زندگی سے خوش نہیں ہیں۔ بلکہ نالاں ہیں کیونکہ یہ سب کچھ ان کی فطرت آزاد کے خلاف ہے۔ مرزا کا بچپن رنڈیوں کی گود میں کھیلا اور لڑکپن طوائفوں کی آغوش میں پلا۔ پھر شباب قید حیات کی قید و بند میں پابند کیسے رہتے ان کا آغازِ شباب بھی۔ انہی رنگا رنگ بزم آرائیوں کا طلب گار تھا وہ اب بھی بنسی دھر کے ساتھ دیوان خانے میں شطرنج بازی کی محفل جما کر بیٹھے رہتے۔ شطرنج کھیلتے کھیلتے بنسی نے مرزا کا ایک مہرہ مار لیا اور کہا۔

چلئے مرزا جی۔ آپ کا یہ مہرہ بھی پٹ گیا۔ اب کیا چلیں گے؟؟

مرزا نے جواب دیا۔ ہم خود ایک پٹا ہوا مہرہ ہیں ہماری بساطِ زندگی ہی اُلٹ گئی ہے۔ اب تو قدم قدم پر زندگی کی بازی میں مات نظر آرہی ہے ہم کیا چلیں۔ کیا نہ چلیں۔

اس پر میر نے کہا۔ مرزا صاحب ناشکری سے توبہ کیجئے۔ خدا کا شکر ہے۔ یہاں کس چیز کی کمی ہے۔ سسرال بھی ملی ہے۔ تو ایسے بڑے خاندان میں کہ لوگ رشک کرتے ہیں۔ خدانخواستہ آپ مات کیوں کھانے لگے۔ مات ہو آپ کے بدخواہوں کو۔

مرزا نے کہا۔ ٹھیک کہتے ہو میر جی۔ لوگ جیل خانے کو بھی بڑا گھر

کہتے ہیں۔ سمجھ لو کہ ہمیں بھی عمر قید کا حکم سنا دیا گیا اور بیڑی پاؤں میں ڈال کر بڑے گھر پہنچا دیا گیا ہے۔ بخدا اپنی حالت اس سے کم نہیں ہے۔ اپنی زندگی کا بالکل یہی نقشہ ہے۔

سب دوست ہنس دیئے۔ مرزا نے کہا۔

یارو کیا یہ ستم نہیں ہے۔ ہم آزاد منش یاروں کی صحبت میں دن رات وقت گذارنے والے اس قید حیات کو کیونکر گوارا بنائیں۔ اور کیسے دل کو اس راہ پر لائیں۔ وہ بیچاری کمسن دلہن خدا لگتی بات ہے۔ ہمیں اس کی حالت پر ترس آتا ہے۔ سہیلیوں میں گڑیوں کا کھیل کھیلتے کھیلتے ہمارے دامن سے باندھ دی گئی۔ بیچاری نے روزہ نماز کی تعلیم پائی ہے وہ گھر میں چھوٹا سا گھونگھٹ نکالے نماز پڑھتی نظر آتی ہیں۔ ہم تو ان کی یہی خدمت کر سکتے ہیں کہ وضو کے لئے پانی لا دیں۔ اور نماز کے لئے تخت لگا دیں۔ تخت پر جانماز بچھا دیں۔ اگر بہت کرم فرمایا تو ان کے پاس بیٹھکر ان کی رکعتیں شمار کر کے ثواب میں شریک ہو گئے۔ نہ انکی طبیعت ہمیں سمجھے اور نہ ہم ان کا مزاج پائیں۔ تم ہی کہو کہ یہ انداز زندگی کیا ہے؟ بھئی ایمان کی بات یہ ہے کہ انسانی شرافت کا تقاضا ہے کہ میاں بیوی ایک راہ ایک بینت ہوں۔ اور دونوں ایکدوسرے کی مرضی کو سمجھنے اور مل جل کر زندگی گذارنے کے لائق ہوں۔ لیکن یہاں اپنی راہ جدا ان کی راہ الگ۔ پھر زندگی کے مراحل سمجھنے کا وہ شعور نہیں رکھتیں نہ اس بندہ آزاد کو پابندیوں کا ہوش ہے تو پھر ہم ایسے

کسی دوسرے کی مرضی کے تابع کیونکر رکھ سکتے ہیں۔
اسی طرح کئی مہینے گذر گئے۔ ابتداء میں تو مرزا صاحب نے بیگم کی دلداری کی سعی فرمائی۔ اور اپنی طبیعت پر جبر کر کے۔ ان کی طبیعت کا خیال رکھا ان کے ساتھ سسرال کی آمدو رفت بھی جاری رکھی۔ دہلی میں نواب صاحب نے مشاعرہ کی محفلوں کا بھی اہتمام کیا۔ جس سے مرزا کو دہلی میں بھی شہرت ملتی رہی اور مرزا صاحب دہلی کی محفلوں کی جان بن گئے۔ لیکن وہ لمبے قیام سے گھبرا گئے اور آگرہ کی یاد ستانے لگی اور واپسی کی تیاریاں شروع کر دیتے کچھ عرصہ یہ سلسلہ بھی یونہی جاری رہا۔ پھر یہ نوبت آئی کہ مرزا بیگم کے ساتھ ان کے میکے جانے سے گھبرانے لگے۔ اس پر ان میں باہمی نوک جھونک ہو جایا کرتی۔ دونوں ضدی اور دونوں تنک مزاج تھے۔ رواداری اور صلح جوئی کم عمری کی وجہ سے نایاب تھی۔ پھر تعلقات میں یگانگت کون قائم رکھتا۔ چنانچہ بیگم کو مرزا کے دیوان خانے کی بزم آرائیوں سے نفرت ہونے لگی۔ اب وہ مرزا کو دوستوں سے وقت بے وقت ملنے سے روک ٹوک کرنے لگیں۔ چونکہ دونوں خاندانی وضع دار تھے۔ للہٰذا دونوں غم و غصہ کو ضبط کر کے رہ جاتے اور گھر میں کوئی ہنگامہ برپا نہ ہونے دیتے۔ اس میں بیگم کی صلاحیتیں زیادہ کارفرما تھیں۔

★

مرزا سن شعور کو پہونچنے سے پہلے ہی آزاد طبع رنگین و طرحدار عورتوں سے ربط رکھنے کے عادی ہو چکے تھے۔ لیکن آمدنی کے ذرائع سمٹتے چلے جا رہے تھے۔ مرزا نے والدہ کی نصیحت پر غور کر کے اپنے روزمرہ کے معمولات میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا۔ پتنگ بازی اور رقص و سرور کے جلسے کسی حد تک کم ہو گئے۔ دوسری تفریحات میں بھی کمی آ گئی۔ رہن اور قرض نے حالات خراب کر دیئے۔ لیکن مے نوشی بڑھتی چلی گئی۔ ان مصارف کی تکمیل کے لئے لامحالہ روپیہ کی ضرورت تھی۔ چنانچہ دوسری تمام ضروریات کم کر کے مے نوشی کے شغل میں فرق نہ آنے دیا۔ سسرال میں کسی کو معلوم نہ تھا کہ میاں بیوی کے تعلقات خوشگوار نہیں ہیں اور نہ ہی کسی کو تنگدستی کا علم تھا۔ اگرچہ امراؤ بیگم کے والد پابند مذہب ہونے کی وجہ سے اپنی جاگیرداری کے بکھیڑوں کو اپنے بڑے بھائی نواب احمد بخش خان اور دوسرے کارندوں کے سپرد کر کے گوشہ نشین ہو چکے تھے۔ لیکن اتنے بھی نہیں تھے کہ بیٹی کا افلاس دور نہ کر سکتے۔ لیکن بیٹی تو کبھی زبان پہ حرفِ شکایت نہ لائی تھی۔

۱۸۱۱ء کا زمانہ تھا کہ جید عالم ملا عبدالصمد ایران سے بغرض سیاحت ہندوستان آئے۔ یہ ایرانی نژاد پارسی تھے۔ انہوں نے ہندوستان پہنچکر دین اسلام قبول کر لیا تھا۔ اور اپنا آبائی نام ہرمز تبدیل کر کے عبدالصمد رکھ لیا تھا۔ ملا عبدالصمد فارسی اور عربی کے فاضل

اور فلسفہ و منطق کے عالم تھے۔ انہوں نے ممالک عرب و لبغداد میں قریب پچاس برس قیام کے دوران وہاں کے جید علماء فضلاء سے علوم عربیہ اور فنونِ حکمت کی تحصیل کی تھی۔ یہ بزرگ آگرہ میں آئے تو مرزا نوشہ نے ان کی تعریف سنی ان سے ملاقات کی اور نہایت اصرار سے انہیں اپنے ہاں لے آئے اور استاد کی حیثیت سے اپنے ہاں عزت و احترام کے ساتھ رکھ لیا۔

اب مرزا صاحب اردو میں کم اور فارسی میں زیادہ شعر کہنے لگے استاد کے فیض صحبت نے مرزا کی فطری صلاحیتوں کو جلا دی اور ان کے علم کو کمال کے جوہر بخشے۔ جب امراؤ بیگم کی زبانی نواب الٰہی بخش خان کو اپنے داماد کی اس علمی مصروفیت کا علم ہوا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ اور بیٹی کی شکایت نے اُلٹا رنگ جمایا۔

ملکہ بیٹی کو مبارکباد دی کہ تمہیں ایسا علم دوست اور شاعر شوہر خدا نے عطا کیا ہے۔ لیکن امراؤ بیگم کی والدہ چنداں خوش نہ تھیں۔ نہ تو بیٹی کے گھر میں امارت چاہتی تھیں افلاس نہیں۔

چنانچہ انہوں نے اپنے شوہر سے کہا کہ سرکار کے دربار میں آپ کا اثر و رسوخ ہے۔ آپ بڑے لاٹ صاحب سے سفارش کر کے مرزا کو فوج میں رسالداری ہی دلوا دیں۔ اس سے عزت بھی ہو گی اور کمائی کا ذریعہ بھی بن جائے گا۔ نواب صاحب علم دوست تھے۔ انہوں نے کہا۔ شاعر لوگ ایسی پابند زندگی بسر نہیں کرتے۔ مرزا

فضیلت حاصل کرلیں گے تو پھر محکمہ تعلیم میں کوئی اعلےٰ منصب پانے کے لائق ہوجائیں گے۔ بیگم نے جل بھن کر جواب دیا۔ بھلا بچے پڑھانا بھی کوئی عزت کا کام ہے۔ یہ تو ملا لوگوں کا پیشہ ہے۔ اور ہمیں داماد کو ملا نہیں بنانا۔ کیا وہ عمر بھر ملاگیری کرے گا۔؟ مجھ کو اس کی ذرا بھی خوشی نہیں۔ اگر آپ کسی سے کہنا پسند نہیں کرتے تو بھائی احمد بخش خاں صاحب کو یہ صاحب لوگ بہت مانتے ہیں۔ آپ ان سے ہی کہئے۔ وہ سفارش کرکے مرزا کو کوئی عہدہ دلوادیں۔ فوج میں رسالداری۔ جمعداری۔ یا دفعداری تو مل ہی جائے گی۔ نواب صاحب نے ہنس کر کہا۔ بیگم آپ بھی خوب باتیں کرتی ہیں۔ آپ کو مرزا کی لیاقت کا کوئی اندازہ نہیں ہے۔ اس کی طبیعت اور مزاج اور ہے۔ فوج میں وہ کام نہیں کرسکے گا۔ مفت میں ہم اس کی زندگی خراب کرنے کے ذمہ دار ہو جائیں گے۔

بیگم نے تنک کر کہا۔ اے واہ اپنی سونا سی بیٹی کی زندگی خراب ہوجائے تو ہوجائے۔ لیکن چہیتے داماد کا دل میلا نہ ہو۔ وہ فوج میں بھلا کیونکر کام کرسکیں گے۔ محنت جو کرنی پڑے گی۔ صاحبزادے کو۔

نواب صاحب نے کہا۔ خوب کہا کہ ہم بیٹی کی بربادی میں خوش ہیں۔ خدا قسم آپ اس کے مزاج کو بالکل نہیں جانتیں۔ نہ ہی اس کی صلاحیتوں سے آگاہ ہیں۔ میرا ایمان ہے کہ مرزا علم و ادب کے آسمان پر ایک ایسا آفتاب بن کر چمکے گا کہ قیامت تک اس کی روشنی

مدھم نہیں ہوگی۔ اب بتاؤ تم وہ عزت چاہتی ہو یا نوکری کی ذلالت پسند کرتی ہو۔ آپ بیکار نہ بگڑ مائیں۔ اُس کی طبیعت فوج کے قابل نہیں ہے۔ بیگم گرم مزاج تھیں بولیں۔ کیوں نہیں ہے۔ آخر فوج میں انسان ہی جاتے ہیں۔ اس میں کون سے سرخاب کے پَر لگے ہوئے ہیں یہ سُنکر نواب صاحب کو بیساختہ ہنسی آگئی۔ اور بیگم جھنجھلاکر خاموش ہوگئیں۔

نواب صاحب دیوان خانے چلے گئے۔ محلہ سے کچھ عورتیں اُمراؤ بیگم کا سُن کر اس سے ملنے چلی آئیں۔ آتے ہی عورتوں نے اپنی فطرت کے مطابق سوال کرنے شروع کردیئے۔

ایک عورت : اے بہو بیگم سُنا ہے دولہا میاں دلہن کے ساتھ نہیں آئے۔

بیگم : ہاں اس مرتبہ نہیں آسکے۔

عورت : اے واہ اس مرتبہ کی بھی خوب کہی۔ ہم تو اب تک ساتھ جاتی ہیں۔ ساتھ آتی ہیں۔ اور ان کے تو ابھی چاؤ بھی پورے نہیں ہوئے۔

بیگم : وہ کچھ زیادہ ہی مصروف تھے۔ اسی لئے امراؤ بیگم کے بھائی کو آگرہ بھیجدیا تھا۔

دوسری عورت : کیوں جی مرزا نوشہ کی جاگیر کتنی ہے۔

بیگم : بس ٹھیک ہے۔ آمدنی کافی ہے۔ خوشحالی سے گذر ہو رہی ہے۔

عورت ۔ اے پھر بھی۔

بیگم ۔ اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ میاں بیوی میں محبت سے بسر ہوتی ہے۔ امراؤ کی ساس حقیقی بیٹی کی طرح اس سے برتاؤ کرتی ہے۔ اپنے بیٹے سے زیادہ بہو پر جان چھڑکتی ہے۔

عورت ۔ اے چشم بد دور۔ ایسا بانکا جوان ہے۔ فوج میں کوئی عہدہ کیوں نہیں لے لیتا۔ پگڑی پر کلغی اور کمر میں تلوار باندھ کر گھوڑے پر سوار نکلے گا تو دیکھنے والے دیکھتے رہ جائیں گے۔

دوسری عورت ۔ اے میں نے تو کچھ اور ہی سُنا ہے۔

بیگم ۔ کیا سُنا ہے تم نے۔

عورت ۔ پچھلی مرتبہ جو دولہا میاں یہاں آئے تھے اور کسی رئیس کے ہاں ان کی دعوت تھی۔ تو وہاں دولہا میاں نے گا کر سنایا تھا۔

دوسری عورت ۔ اوئی اللہ۔ کیا مرزا نوشہ گاتے بھی ہیں۔

بیگم ۔ تم نے بھی خوب سُنا۔ تم بھی خوب سمجھیں۔ وہ اپنی غزل ترنم سے سُناتے ہیں۔ ورنہ وہ ایرانی امیروں کی اولاد تورانی شہزادہ کیوں گانے لگا۔

دوسری عورت ۔ کچھ امراؤ بیگم کے ناز انداز سے وہ بات نہیں ٹپکتی۔ جو نئی نویلی دلہن کے شایاں ہوتی ہے۔

بیگم :۔ تم امراؤ کو بچپن سے جانتی ہو ۔ خاموش طبع ہے نماز روزہ سے سروکار ہے ، چنچل اور بے باک نہیں ہے ۔

عورت :۔ ہاں بہن یہ بات تو ہے لیکن ۔

★

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز

عیش ونشاط کی بزم آرائیاں مدھم پڑی تھیں۔ فضول خرچیوں سے قدرے ہاتھ کھینچا تھا۔ پری چہرہ لوگوں کی یاد سے دل کو سنبھالنے میں کچھ کامیابی ہوئی تھی۔ خورشید کو بلائے اور رام کلی کو منہ لگائے عرصہ ہو گیا تھا۔ کوچہ یار میں قدم رکھے اور ستمگری کا مزا چکھے مدت ہو گئی تھی۔ مرزا نے اپنی وفادار دلہن کی طرف دھیان دیا تھا۔ مرزا نے گھر یلو ذمہ داریوں کی طرف توجہ دی تھی۔ خانۂ عزت میں چراغِ اُمید روشن ہونے والا تھا۔ گلستانِ غالب میں غنچہ چٹکنے والا تھا۔ یعنی امراؤ بیگم کی گود بھرنے والی تھی۔ بڑی بیگم کی خوشیوں کی انتہا نہ تھی۔ وہ اپنی بیوگی کے تمام رنج وغم اور تنگی ترشی کے سارے الم بھول کر غیر معمولی خوشیاں منانے میں مصروف تھی۔

وہ صبح طلوع ہوئی صحن خانہ میں مبارک مبارک کی آوازیں بلند ہوئیں۔ ولادت فرزند کی مبارک خبر آگرہ سے دہلی پہونچی۔ مرزا الٰہی شاد

نظر آتے ہیں اولاد کی شفقت و محبت سے آباد نظر آتے ہیں۔ ڈاک کا سانڈنی سوار ہیر کا وہ یہ نوید لیکر دہلی روانہ ہو گیا۔ بیرونِ خانہ ڈوم اور اندرون خانہ ڈومنیاں مبارک سلامت کے گیت گا رہے ہیں۔ مہمانوں کی آمد آمد ہے۔ عزت النساء بہو کے سرہانے بیٹھی واری قربان ہو رہی ہے۔ جو سلام کرنے آتا ہے مٹھی بھر کر خیرات دے دیتی ہے۔ کسی کو پوتے کے قریب نہیں آنے دیتی۔ کسی عورت کو زچہ کے پلنگ کے قریب نہیں ہونے دیتی۔ بچے کو اپنی گود میں لئے صدقے قربان ہو رہی ہے۔ ایک ہنگامہ مسرت بپا ہے۔

چند روز بعد دہلی سے سمدھیانے کے مرد اور عورتیں مسرتوں کے قافلے بن کر آگرہ پہنچ گئے۔ خصوصاً الور اور لوہارو سے مہمانوں کے قافلے آ گئے۔ حاجی خان کا خاندان بھی آگیا ہے۔ جو میکہ اور سسرال دونوں میں شریک ہے۔ مہمانوں کا یہ اجتماع چھٹی کی رسم ادا کرنے کے لئے ہوا ہے۔ یہ جشن مرزا کی شادی سے کم نہیں بلکہ کچھ زیادہ ہی نظر آتا ہے۔ محفلیں منعقد ہو رہی ہیں۔ گانے ناچنے والیوں کے طائفے آگرہ ہی سے نہیں دہلی سے بھی آئے ہیں۔ آگرہ کے طائفے میں ایک خاندانی میراثن الٰہی جان کا طائفہ سب سے اعلےٰ ہے۔

الٰہی جان صورت و سیرت میں حد درجہ قابلِ ستائش ہے اور کمالِ فن میں بھی اپنا مقابل نہیں رکھتی۔ سولہ سترہ برس کی عمر بوٹا سا قد۔ رعنائی و زیبائی میں لاجواب۔ رقص میں سانپ۔ نغمہ سرائی

میں کوئل ہے۔ اس نے ایک گانا مبارک بادی کا گایا اور پھر جتنی مرتبہ اس کی باری آئی اس نے مرزا نوشہ کے کلام کے سوا کوئی چیز نہ گائی۔ اور ہر غزل کچھ اس حسن و انداز سے ادا کی کہ عورتیں عش عش کرنے لگیں۔ اس کا تذکرہ دیوان خانے تک پہنچا اور مہمانوں کو بھی اس کے سننے کا اشتیاق ہوا لیکن اس زمانہ میں دستور تھا کہ ڈومنیاں اور مراثنیں غیر مردوں سے شریف عورتوں کی طرح پردہ کرتی تھیں اور صرف زنانہ محفلوں میں جایا کرتی تھیں۔ شرفا کی طرح وہ بھی صرف اپنے خاندان میں شادی بیاہ کرتی تھیں۔ غیر مرد ان کی صورت تک نہ دیکھ سکتے تھے۔ گانا ناچنا ان کا آبائی پیشہ تھا۔ جس میں ان کے مرد بھی حصہ لیتے تھے۔ یہ لوگ امراؤ رؤسا کے گھروں میں عیدبقرعید۔ یا شادی بیاہ کے موقعہ پر حاضری دیتے تھے اور انہیں ناچ گانے سے خوش کر کے انعام پاتے۔ یہاں تک کہ رئیس لوگوں سے ماہانہ تنخواہ تک پاتے تھے اور اس کے عوض حسب طلب حاضری دیتے تھے۔ اس وجہ سے ڈر تھا کہ الہٰی جان دیوان خانے میں آنے سے انکار نہ کر دے۔ چنانچہ نواب احمد بخش خاں صاحب کی وساطت سے اُسے کہلوایا گیا کہ ایک مجرا مردانہ بھی ہو جائے۔ دیکھا جائے تو یہ اس کی بڑی قدر دانی تھی کہ سب کو نظر انداز کر کے صرف اسی کو مردانہ محفل کے لئے دعوت دی جائے۔ لیکن وہ اپنے خاندان رواج سے مجبور تھی۔ پر مہمانوں کا اصرار تھا کہ جس کی ایسی دھوم ہے اس کا مجرا ہم بھی دیکھیں گے۔ الہٰی

جان کے والدین نے نوابوں اور رئیسوں کی طلب پر ہاں کردی اور یہ شرط ٹھہری کہ دیوان خانے میں صرف خاندانی اصحاب شرکت کریں گے۔ اور نوکر چاکر۔ شاگرد پیشہ اور دوسرے عام شہری مہمان موجود نہ ہوں گے۔

اس کی شرط مان لی گئی اور ایک مخصوص بزم سردر آراستہ کی گئی۔

الٰہی جان زنانہ سے مردانہ تک پردے میں آئی اور مردانہ میں آکر جب اس نے نقاب الٹا تو لوگ حسن و جمال کی حور بے مثال دیکھ کر دم بخود رہ گئے۔ نہ اس کا آگرہ میں جواب تھا نہ دلی میں مقابل تھا۔

اس جاں نثار نے پہلے اپنے محبوب مرزا نوشہ کو جی بھر کر دیکھا۔ ادب سے سلام کیا۔ پھر نوابوں اور اُمرار لوگوں کو سلام کیا۔ اس نے پاؤں میں گھنگرو باندھے پھر مرزا سے اجازت چاہی کہ ان کی غزل پیش کرے۔ مرزا نے اجازت فرمادی۔ وہ اُٹھی۔ سازندوں کو اشارہ کیا۔ خود گنگنا کر دھن نکالی اور سازندوں کی رہنمائی کی۔

سراپا غزل نے غزل چھیڑی۔

★

غزل

رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے
دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے

صرفِ بہائے مے ہوئے آلاتِ مے کشی
تھے یہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے

رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے ہم
بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر
پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا
آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

اس رنگ سے اٹھائی کل اس نے ہماری نعش
دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے

مقطع میں مصرع اولیٰ میں "اسد کی نعش" کی جگہ "ہماری نعش" کی تبدیلی مرزا اور واقف حاضرین کو کھٹکی۔ بنسی دھر نے آواز بلند کی (خوب ہے استاد جی یہ مرزا صاحب کے کلام میں اصلاح ؟)

میر نے کہا۔ اسد کی جگہ ہماری خوب تبدیل کیا۔

الٰہی جان نے دست بستہ ہو کر عرض کیا۔ سرکار گستاخی معاف ہماری نعش اسد پر قربان کنیز نے دانستہ تبدیلی کی ہے۔ اسد زندگی کی سو بہاریں دیکھئے ان کی جان پر ہماری جان نثار۔

خان نے کہا۔ الٰہی توبہ۔ احباب ہنس پڑے۔ سب نے الٰہی جان کی نکتہ سنجی کی داد دی مرزا خود بھی کہہ اٹھے۔ خوب بہت خوب شاید اور بھی کچھ کہنا چاہتے تھے۔ لیکن پہلو بدل کر تنبیہا کر گئے۔

نواب الٰہی بخش خان جو خود علم دوست تھے۔ بہت مسرور ہوئے چاہا کہ اسی بہانے ہونہار داماد کی ایک اور غزل سن لیں۔ فرمائش کی کہ الٰہی مرزا جی کی کوئی اور چیز یاد ہو تو سناؤ۔ الٰہی نے حجاب کر عرض کیا۔ حضور نواب صاحب مرزا نوشہ نے جس قدر اب تک ارشاد فرمایا ہے، باندی کو حرف حرف حفظ ہے۔ لیجئے مرزا جی کی ایک تازہ غزل ملاحظہ فرمائیے۔

★

غزل

چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے
یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے
چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل
بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیے
چاک مت کر جیب بے ایام گل
کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیے
دوستی کا پردہ ہے بیگانگی !
منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے
اپنی رسوائی میں کیا چلتی ہے سعی
یار ہی ہنگامہ آرا چاہیے
غافل اُن مہ طلعتوں کے واسطے
چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

الٰہی جان نے چاہا کہ مقطع کے بغیر غزل ختم کر دوں۔ لیکن محفل منتظر تھی کہ غزل کا مقطع کیا ہے۔ جب الٰہی جان خاموش ہوئی تو نواب صاحب نے پوچھا۔ کیوں مرزا جی غزل کا مقطع نہیں ہوا کفد یا الٰہی

جان نے کھو دیا ہے۔

الٰہی جان نے اس میں سبکی پائی اور فوراً عرض کیا۔ جی نہیں غزل بے مقطع نہیں ہے۔ اور نہ ہی الٰہی جان نے بد دیانتی کی ہے۔ نواب صاحب نے پوچھا۔ پھر مقطع کیوں نہیں کہا۔ الٰہی جان نے دست بستہ عرض کیا۔ یہ میرا منہ نہیں کہ مقطع عرض کر سکوں۔ نواب صاحب نے کہا کل جسے ساری دنیا سنے گی ہم کیوں نہ سنیں۔ اس اصرار پر الٰہی جان نے مقطع کہا۔

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے

اس پر محفل میں ایک قہقہہ اٹھا۔ دلی کے ایک مہمان شاعر نے کہا۔ یہ مقطع اس چاند سی صورت کے لئے مناسب نہیں البتہ ابراہیم ذوق دہلوی فرماتے تو بات بنتی تھی۔ اس پر ایک قہقہہ اٹھا۔ اس کے بعد وہ رخصت کی اجازت کے لئے نواب صاحب کے سامنے گئی نواب صاحب نے دو تھیلیاں انعام کی آگے بڑھا دیں الٰہی نے جھک کر سلام کیا۔ شکریہ ادا کیا۔ اور کہا۔ باندی آگرہ میں خاک نشین ہے۔ اور حضور اہل آگرہ کے مہمان عزیز ہیں۔ میں اپنا انعام بیگم حضور سے لونگی۔ یہ کہہ کر وہ الگ ہو گئی اور زنانخانہ میں چلی گئی۔ الٰہی جان نے اس رقم سے گویا مرزا جی کا دل خرید لیا۔ مرزا پر الٰہی جان کی دانشمندی کا بڑا گہرا اثر پڑا۔ اس کے بعد رام کلی کو مجرا کے لئے بلایا گیا۔ رام کلی مرزا کی طرف

سے ستائی ہوئی وحشتکاری ہوئی اور ٹھکرائی ہوئی تھی۔ اس نے مرزا کی یہ غزل سُنائی۔

★

غزل

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تیری شہرت ہی سہی
قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی
اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی
ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے
غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی
اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو!
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی
عمر ہر چند کہ ہے برقِ خرام
دل کے خون کرنے کی فرصت ہی سہی
ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں

نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی
کچھ تو دے اے فلک ناانصاف
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے!
بے نیازی تیری عادت ہی سہی
یار سے چھیڑ چلی جائے اسد
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

اس غزل کے بعض اشعار تو اس کے عین حسب حال تھے۔ وہ ان اشعار کو ترنت کے ساتھ بار بار دہراتی رہی اور ان سے داد ملتی رہی کسے معلوم تھا کہ رام کلی نہیں اس کا دل رو رہا ہے۔ اور اپنے ستمگر دوست کے سامنے فریاد کر رہا ہے۔ اس کی بے اعتنائی پر اشکبار ہے۔ ایسا بھی ہوا کہ رام کلی بڑی بے باکی سے ترنت کے ساتھ مرزا کے سامنے جاکر اشارے کر کے گاتی رہی۔ معلوم ہوتا تھا کہ رام کلی بھری مجلس میں مرزا کو رسوا کر کے چھوڑے گی۔ لیکن مرزا اور اس کے دوست اس کے انداز بیان کی تعریف کر کے بات بدلنے کی کوشش کرتے رہے۔ دراصل وہ جلی بھی بہت طوفان کئے ہوئے تھی۔ کئی مرتبہ تو مرزا بھی گھبرا کر رہ گئے۔ مرزا کے سامنے سسرال والے عزیز و اقارب تشریف فرما تھے۔ بالخصوص نواب الٰہی بخش خان اور نواب احمد بخش خان اور حاجی خان سامنے والی نشستوں پر مسند نشین تھے۔ اگر انہیں

ذرہ برابر بھی شبہ ہو جاتا تو سارے وقار پر خاک پڑ جاتی۔ مرزا دل میں سوچ رہے تھے کہ رام کلی کو بلا کر بہت برا کیا ہے۔ جب رام کلی باز نہ آئی۔ تو مرزا اور بنسی دونوں اٹھ گئے اور بارہ دری میں جا کر بیٹھ گئے۔ پھر بنسی دھر دوبارہ محفل میں آ گئے۔ اور مرزا صاحب وہاں تنہا بیٹھے رہے۔ وہ الٰہی جان کے تصور میں گم تھے کہ چپکے سے الٰہی جان آ کر سامنے کھڑی ہو گئی اور آہستہ سے کہا۔

میں حاضر ہو سکتی ہوں۔؟

مرزا نے اسے حیرت سے دیکھا اور کہا۔ حاضر تو آپ ہو چکیں اب فرمایئے کیا ارشاد ہے۔ وہ چپ رہی نہ کچھ جواب دیا نہ بولی۔ مرزا نے غور سے دیکھا۔ تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔

مرزا نے دامن پکڑ کر بیٹھنے کو کہا۔ الٰہی جان نے آنسو آنچل میں جذب کرتے ہوئے۔ جواب میں عرض کیا۔ دامن پکڑنے کی لاج رکھیئے گا۔ میں اگرچہ میراثن ہوں یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔ لیکن پہلو میں محبت بھرا دل رکھتی ہوں۔ محبت میں وفا کرنا میرے بس میں ضرور ہے سو میں کر گذروں گی۔ مرزا نے مسکرا کر کہا۔ آپ بھی محبت کرتی ہیں۔

الٰہی نے گلے میں گھٹی ہوئی آواز کے ساتھ کہا۔ میں ہلکے خاندان سے ضرور ہوں۔ اس حیثیت سے مجھے اسی طعن کی توقع تھی۔ لیکن مجھ سے کسی ہلکے پن کی توقع نہ رکھیئے گا۔ میں دوسروں کی طرح بازار کی مٹھائی نہیں ہوں۔ میں اپنے دل کے مندر میں آپ کو رکھ چکی ہوں۔

میں صرف پُجارن ہوں۔ اب تک یہ راز پوشیدہ تھا۔ اب آپ کے پاس امانت ہو چکا ہے۔ تھوڑی دیر حسن و عشق کے راز و نیاز ہوا کئے۔ بیگم الٰہی جان نے مرزا سے وعدہ لیا کہ وہ ہمیشہ اپنا تازہ کلام اس تک پہنچاتے رہیں گے۔ پھر چلتے چلتے کہنے لگی۔ میرا گھر آپ کے لائق تو نہیں۔ لیکن میری منتظر آنکھیں اور بیتاب دل ضرور آپ کی راہ پر لگے رہیں گے۔ کبھی زحمت فرمایئے گا۔ یہ کہکر وہ چلی گئی۔ چلی کیا گئی مرزا کو بھی ساتھ لے گئی۔

مرزا نے بے ساختہ یہ شعر کہا ؎

رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے
لے کے دل دلستاں روانہ ہوا

★

پھر کس بے وفا پر مرتے ہیں

الہٰی جان کو مرزا سے مِل کر گئے ہوئے کئی روز ہو گئے تھے۔ الہٰی جان ہر روز ہر شب مرزا کا انتظار کر کے مایوس ہو کر بیٹھ جاتی۔ اس نے کئی بار اپنے نوکر سے مرزا کو کہلا بھیجا اور ہر بار مرزا نے ٹال دیا۔

آج الہٰی بیحد اُداس تھی ماں نے پوچھا۔

ماں۔ کیوں چاند طبیعت کیسی ہے؟

الہٰی۔ ٹھیک ہے اماں۔

ماں۔ مجھ سے چھپا کر تمہیں کیا ملے گا۔؟

الہٰی۔ کیا چھپا رہی ہوں میں تم سے؟

ماں۔ پگلی نہ بن۔ دل کو اپنے کہنے میں رکھ۔ سوجھ بوجھ سے کام لے۔ یہ عشق وشق کی باتیں ہم لوگوں کو اچھی نہیں لگتیں۔

الہٰی۔ کیا عشق۔ کس کے عشق کی باتیں؟

ماں۔ سنو رانی۔ اگر ہم لوگ اس طرح دل لگانے لگیں تو کہیں کے

نہ رہیں۔ یہ ہری چگ لگ دولت کے سہارے لوگوں سے کھیلنے آجاتے ہیں۔ دولت لٹائی دل بہلایا اور چلے گئے۔ نہ ہم ان کے لائق نہ وہ ہمیں اپنے قابل تصور کریں۔ وہ جب چاہیں کھلے دروازے آجائیں۔ اور ہم لاکھ چاہیں۔ مگر ان کی دہلیز پہ قدم نہیں رکھ سکتے۔ ان کی دہلیز پر ہمارے قدم کا نشان ان کے خاندانی وقار پر بدنما دھبہ بن جاتا ہے۔ اور وہ قدم رنجہ فرمائیں تو دوسروں کے لئے باعث رشک ہوتا ہے۔ اور ہمارے لئے باعث عزت۔

میری بنو۔ اس فرق کو ذہن میں رکھو اور پھر کسی رئیس زادے تماش بین سے دل لگانے کی سوچو۔

الہی۔ بہت سوچا ہے اماں مگر ....

ماں۔ مگر دل سے مجبور ہو، ہے نا؟ ہوش کی دوا کر اس درد کا دھیان چھوڑ دے۔

الہی۔ ہائے اماں۔ دھیان چھوڑنے کی بھی خوب کہی۔ میں نے تو لاکھ کوشش کی کہ اس بے مروت کا دھیان ہٹ جائے۔ مگر کم بخت وہ صورت ہی ایسی ہے۔ اور اس انداز سے دل پہ نقش ہوا ہے کہ بھلانے سے بھولتا ہی نہیں۔ بہت جتن کئے کہ اس بے مہر سنگدل کو بھول جاؤں۔ مگر ان کی صورت ہر لمحہ سامنے رہتی ہے۔

ماں۔ تو تو دیوانی ہو گئی ہے۔ یہ بھی نہ دیکھا ہے کہ اس دن آنے کا وعدہ کیا تھا۔ مہینوں گذر گئے ایک بار ادھر کا رخ نہیں کیا۔ بلانے

پر بھی ٹالتے رہتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے تو راستے میں دریا نہیں پڑتا تھا۔

الہی جان۔ میں یہ جانتی ہوں کہ میرا ان کا کوئی ساتھ نہیں ہے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ موری کی اینٹ چبارے پر نہیں لگ سکتی۔ لیکن کیا کروں اس ظالم کو بھول نہیں سکتی۔ دل گواہی دیتا ہے کہ وہ آئیں گے۔

ماں۔ خاک آئیں گے۔ آنا ہوتا تو آنہ جاتے۔ انہیں کیا مجبوری تھی۔ کہیں اور دل لگا بیٹھے ہوں گے۔ یا رام کلی نے پاؤں پکڑ کر منا لیا ہوگا۔ یا وہ نوچی خورشید دامنگیر ہوگئی ہوگی۔

الہی۔ ہاں کچھ ایسا ہی ہوگیا ہوگا۔ پھر خدا نہ کرے ایسا ہوگیا ہو۔

ماں۔ چل چھوڑ موئے مرزا کا خیال۔ ہزار مرزا تجھ پر قربان ہونے کو تیار ہیں۔ صرف تیری نگاہِ کرم کے منتظر ہیں۔ اپنی صورت دیکھ برسوں کی بیمار معلوم ہوتی ہے۔ یہی حال رہا تو اپنا کاروبار کیسے چلے گا؟ کچھ گھر کا بھی خیال ہے۔ یا خالی خولی پیار بگھارنے سے خرچ پورا ہو جائے گا۔

الہی۔ مجھے جہاں چاہے بیچ دو ماں۔ اپنے خرچ پورے کرلو۔ میں کچھ نہ کہوں گی۔ میں کہہ بھی کیا سکتی ہوں۔

(یہ کہکر وہ اپنی ماں سے لپٹ گئی اور ہچکیاں بھر کر رونے لگی)

مرزا نوشہ اس سے پہلے جو عشق و عاشقی کے کھیل کھیل چکے تھے اور نامرادی کا داغ کھا چکے تھے دلی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی تھا۔ چنانچہ اب مرزا الہی جان کے حسنِ دلفریب و دلآویز سے بچے رہنے کی

کوشش کیے جا رہے تھے۔ الٰہی جان دوسرے چوتھے روز اپنے نوکر کے ذریعہ مرزا کو بلانے کی کوشش کرتی ہے۔ مگر مرزا ٹالتے جا رہے ہیں۔

کیونکہ سابقہ تجربہ ایسا تلخ ہے کہ انہیں بازارِ حسن سے بیزار کر چکا ہے۔ دوسری وجہ ان کی مالی حالت کی ابتری ہے۔ اب حالات سازگار نہیں ہیں۔ کافی حد تک جائیداد لٹا چکے ہیں۔ بیٹے کی ولادت پر جو کچھ بچی کھچی تھی۔ وہ بھی کچھ رہن ہو گئی کچھ بک گئی اور جو رہ گئی ہے اس کا کرایہ اتنا قلیل ہے کہ گذر اوقات بیحد مشکل ہو رہی ہے۔ گذر اوقات تو ہو جائے بشرطیکہ شریفانہ گذر کریں ساری آمدنی تو شراب کی نذر ہو جاتی ہے۔ گھریلو اخراجات کیسے پورے ہوں۔ مصارف امیرانہ اور آمدنی غریبانہ ہے۔ اب مرزا کو عیش و عشرت سے گریز لازم ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ بازاری عورتوں سے میل ملاپ بغیر روپے کے ممکن نہیں ہوتا۔ اگرچہ الٰہی جان کے پیام پر پیام سن سن کر آتشِ شوق بھڑکتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ساری رسیاں تڑا کر اُس کوچے میں پہونچ جائے مگر کمال ضبط سے کام لیتے ہوئے خاموش ہو کر رہ جاتے ہیں۔ بہت کرتے ہیں تو جواب میں تازہ غزل بھیج دیتے ہیں۔ اپنی آتشِ شوق کو یہ کہکر ٹھنڈا کر لیتے ہیں۔

★

غزل

مزے جہاں کے اپنی نظر میں خاک نہیں
سوائے خونِ جگر سو جگر میں خاک نہیں

مگر غبار ہوئے پر ہوا اُڑا لے جائے
وگرنہ تاب و تواں بال و پر میں خاک نہیں

یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے
کہ غیر جلوۂ گل رہ گزر میں خاک نہیں

بھلا اُسے نہ بھی کچھ مجھی کو رحم آتا
اثر میرے نفس بے اثر میں خاک نہیں

خیال جلوۂ گل سے خراب ہیں میکش
شراب خانے کے دیوار و در میں خاک نہیں

ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ
سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسد
کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

★

الٰہی جان نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ اب نوکر کو

ادھر بھیجنا بند کر دیا۔ چاہا کہ مرزا کے نام سے نفرت ہو جائے۔ اس نے پھر سنگار کیا اور محفل لگا کر بیٹھ گئی۔ تماش بینوں کی آمد و رفت شروع ہوئی۔ اسی طرح کئی ہفتے گذر گئے۔ اب مرزا الہی جان کی خاموشی سے بیتاب ہو گئے۔ وہ دل کے ہاتھوں مجبور تھے۔ لگی دل کی بُری ہوتی ہے۔

الہی جان نے پھر حُسن و محبت کی دکان سنبھالی۔ دولت کا بیوپار ہونے لگا۔ لوگ آنے لگے دل لگی کرنے لگے۔ نائیکہ پھر دونوں ہاتھوں سے دولت لوٹنے لگی۔ وہ ہر قدم پر کھڑی الہی جان پر وارے قربان جاتی لیکن ؎

گو ہم رہے رہین ستمہائے روزگار
لیکن تیرے خیال سے غافل نہیں رہے

الہی جان جب بھی آئینہ کے مقابل سنگھار کرنے بیٹھتی سامنے مرزا کی صورت آجاتی۔ اور وہ بیقرار ہو کر دل تھام لیتی اور ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ بے معنی باتیں شروع کر دیتی۔ مگر تہیہ کئے ہوئے تھی کہ مرزا کو خط نہ لکھوں گی۔ نوکر کو کبھی نہ بھیجوں گی۔ ادھر مرزا لمبا انتظار نہ کھینچ سکے۔ دلِ بیتاب کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک صبح پرچے پر یہ شعر لکھکر الہی کو بھیجدیا ؎

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

★

الہٰی نے یہ پرچہ پڑھا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ چیخ کر بولی۔ اماں دیکھو مرزا جی نے پرچہ بھیجا ہے۔

ع

دیکھ لیجئے ضبط دل ہی ہو گیا ہے کارگر
عشق کا اس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہ تھا

ماں نے کہا۔ بس ایک بار مجھے وہاں سے ہو آنے دو۔ پھر دیکھنا مرزا کیسے نہیں آتے۔

ایک روز نائیکہ مرزا کے پاس گئی۔ قدم پکڑ کر روئی دھوئی۔ کہ میری اکلوتی جوان سونا سی بیٹی آپ کی جدائی میں گھل گھل کر ادھ موئی ہوئی جا رہی ہے۔ بڑے بڑے امیر زادے اس کے حسن و جمال پر دم دیتے ہیں۔ لیکن وہ کسی کو نگاہ میں نہیں لاتی اور صرف آپ کے لئے بیقرار ہے۔ خدارا میرے ساتھ چلئے اور اس بے تقصیر کی خبر لیجئے۔ للٰہ اس کی جان بچا لیجئے۔ مرزا جی نے معذرت کے ساتھ کہا۔ ہم کسی کے کوٹھے پر نہیں جاتے۔ نہ کسی عورت کے گھر جاتے ہیں آپ کا گھر بھی ان گھروں میں شمار ہے۔ ہم جیسے دوسرے امیر زادوں کی وہاں آمد و رفت ہے کوئی ہمیں وہاں دیکھے گا۔ تو بدنام کرے گا۔ ہمارے جاننے والے اگر اس بات سے خبردار ہوئے تو کیا کہیں گے۔

مگر نائیکہ نے رو دھو کر مرزا کو رضامند کر ہی لیا۔ آخر مرزا نے

کہا کہ ہم کل رات گئے آپ کے گھر آئیں گے۔ خبردار وہاں کوئی دوسرا نہ ہو۔ الہی جان کے حسن و جمال میں وہ دلکشی تھی کہ مرزا ہزار وجوہات کے باوجود نہ رک سکے۔ وہ دوسرے روز رات گئے چپکے سے زیوان خانے سے اٹھے اور سیدھے الہی جان کے گھر چلے گئے۔ الہی جان ہر آہٹ پر سراپا گوش تھی۔ سازندے بھی جاگ رہے تھے کہ شاید خلوت کی بزم آرائی ہو۔ مرزا پہونچے الہی جان کے درو دیوار نے خوش آمدید کہا۔

الہی جان نے طرح طرح کے کھانے پکا رکھے تھے اور نہایت عمدہ قسم کے آم بھی منگوا رکھے تھے۔ برف آب کا سامان بھی تھا۔ الہی جان نے کھانے کے لئے کہا تو مرزا نے کہا۔ بھئی خوب یہ وقت کھانے کا ہے۔ الہی جان نے کہا۔ میں تو آپ کے انتظار میں بیٹھی ہوں کہ حضور آئیں تو مل کر کھانا کھائیں۔ اس تمنا پر مرزا نے مسکرا کر کہا۔ آپ اپنے لئے کھانا منگوائیں آپ کی خوشی میں میں بھی شریک ہو جاؤں گا۔ الہی جان کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ دستر خوان چُن دیا گیا۔ عجیب بات تھی کہ تمام کھانے مرزا کی پسند کے تھے۔ مرزا نے ازرہ تکلف ہاتھ بڑھایا۔ اور جب نائیکہ نے آم لاکر رکھے تو مرزا نے ہاتھ کھینچ لیا۔ الہی جان سمجھ گئی اس نے دستمال سے انگلیاں صاف کرلیں۔ اور پلیٹ میں آم رکھ کر مرزا جی کے سامنے بڑھا دیئے۔ مرزا جی نے کہا۔ دیکھو الہی میں نے آپ کے ساتھ کھانے میں تکلف برتا ہے چاہئے کہ آپ بھی ہمارے ساتھ آموں کے معاملہ

بین تکلف برتیں۔

الہی جان ہنس پڑی اور کہا۔ آم اور بھی ہیں آپ شوق فرمائیں۔ یہ رات اسی طرح گذر گئی۔

سازندے سو گئے۔ نائیکہ کی بھی آنکھ لگ گئی۔ مگر دو محبت بھرے دل نہ سوئے اور نہ اونگھ لی۔ اب مرزا نھنے اور الہی جان کی بزم خلوت وہاں رات رات بھر شعر و نغمہ کی محفل برپا ہونے لگی۔ اور گھر پر ان کی بیگم تنہائی کی راتیں گذارنے پر مجبور ہو گئی۔ وہ مرزا کی مصروفیت سے بے خبر تھی۔ مرزا کی آمدنی پہلے ہی محدود ہو چکی تھی۔ اب مصارف میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ قرض داری بڑھتی چلی گئی۔ اب مرزا گھر سے رات رات بھر غائب رہنے لگے۔ ان کی والدہ کو بھی تشویش ہوئی۔ بہو سے پوچھا تو وہ پردہ ڈال گئی۔ خاندانی غیرت نے اجازت نہ دی کہ شوہر کی کارگذاریوں کو بے نقاب کر دے۔ صبر و شکر کے ساتھ وقت گذارتی چلی گئی۔

اب الہی جان اور مرزا کے درمیان عشق و عاشقی کے نازک مرحلے طے ہونے جا رہے تھے۔ الہی اس فکر میں تھی کہ مرزا کو مجبور کرے کہ مستقل طور پر ان کی ہو رہے۔ کیونکہ الہی جان کی مرزا کی گھریلو زندگی کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے کہ مرزا اپنی بیوی سے خوش نہیں ہیں بلکہ وہ گھر کی چار دیواری سے سخت گھبراتے ہیں۔ یہ صرف بڑی بیگم نے اپنے چاؤ پورے کرنے کے لئے دو جانوں پر ستم ڈھا رکھا ہے اور اب یہ دونوں خاندانی شرافت کے تقاضے وہ نبھا رہے ہیں۔ مرزا واقعی گھر کی فضا سے

بیزار تھے ۔ الہی جان کی حسن صورت خوش ذوقی اور چاؤ چوچلے نے مرزا کو اس کا گردیدہ کر کے گھر سے بے تعلق سا کو دیا تھا۔ الہی جان محبت کی پینگیں بڑھا رہی تھی ۔ اور امراؤ بیگم گھر کی چار دیواری میں مرزا کے کرتوت سے بے خبر بچے کی پرورش میں منہمک ہے ۔

★

اک شمع رہ گئی ہے

مرزا صاحب بیوی بچّوں سے بے نیاز عشق و عاشقی میں رنگ رلیاں منا رہے تھے۔ اچانک چاروں طرف سے مصیبتوں نے آن گھیرا۔ مرزا صاحب کی والدہ بیمار پڑ گئیں۔ اُن پر اچانک بیماری کا جان لیوا حملہ ہوا اس شجرِ عمر کو اندر ہی اندر گھن کھا چکا تھا کہ بیماری کے ایک ہی تیز جھونکے نے جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ مرزا کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ دسویں پر دہلی والے رشتہ دار آگرہ آ گئے۔ گھر میں ایک ماتم برپا ہوا۔ مرزا کو والدہ کا غم تو بھول گیا۔ اور اس فکر میں ڈوب گئے کہ مہمانوں کی خاطر و مدارات کے سامان کہاں سے پورے ہونگے حاجی خان بھی فاتحہ خوانی کے لئے آئے ہوئے تھے۔ وہ بڑے زمانہ ساز آدمی تھے۔ جانتے تھے کہ عیاش مرزا کو یہ فکر آن گھیرے گی۔ اس کمزوری سے فائدہ اٹھانے کے لئے دو یا پانچ ہزار روپیہ ساتھ لیکر آئے تھے۔ جب مرزا مہاجن اور ساہوکار بنیا کی منت سماجت

کو گئے تو بیحد پریشان ہوئے۔ حاجی خان نے موقعہ پاکر خود ہی زخم پر نمک چھڑکا۔ اور مرزا سے پوچھا۔ کیوں صاحبزادے۔ بیگم صاحب کا دسواں ہے۔ کیا انتظامات کئے ہیں! مرزا نے بات ٹالنی چاہی تو حاجی خان نے کہا۔ مرزا بیٹے تم پر یہ مصیبتیں کاہے کو پڑی تھیں۔ تم ان باتوں سے نمٹنا کیا جانو۔ مرحومہ کا دم غنیمت تھا۔ بزرگوں میں سے آخری چراغ تھا۔ وہ بھی گل ہوا۔ یہ باتیں سُن کر مرزا کا جی بھر آیا اور اُن کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ حاجی خان نے اٹھ کر مرزا کو سینے سے چمٹا لیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ جی ہلکا ہوا تو حاجی خان سے کہا۔ خان بابا۔ گھر میں اللہ کا نام ہے اور مہمانوں کا ہجوم ہے کہ بیگم کہہ رہی تھیں۔ خاندانی عزت کا سوال ہے۔ پریشان ہوں کیا کروں۔

حاجی خان نے کہا۔ گھبراؤ نہیں۔ میں اس ساہوکار کے پاس جاتا ہوں۔ جس کے پاس کالے خان والی حویلی رہن ہے۔ رہن تو پہلے ہی بہت بڑھ چڑھ کر رکھی تھی دیکھتا ہوں جو مل جاتے۔ بیچ کر لے آتا ہوں۔ مرزا نے کہا۔ خان بابا۔ اس کا خیال رہے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ حاجی خان نے تھپکی دیکر کہا۔ ہم اس گھر کے بزرگ بھی ہیں اور محافظ بھی۔ یہ کہکر وہ باہر چلے گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ آ گئے۔ مرزا کو اشارہ کیا مرزا دیوانخانے کے پچھواڑے والے کمرے میں چلے گئے۔ وہاں جاکر حاجی خان نے پانچ ہزار روپے مرزا کے سامنے ڈھیر کر دیئے۔ اور کہا بہت لڑ

جھگڑ کر یہ رقم لایا ہوں۔ ساہوکار بڑا طوطا چشم ہے۔ وہ پیٹھ پر ہاتھ ہی نہیں رکھنے دیتا تھا۔ بات ہی نہیں سنتا تھا۔ خرید کی طرف آتا ہی نہ تھا۔ مرزا نے روپیہ سمیٹتے ہوئے کہا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ میں صبح صبح ساہوکار سے ہو آیا ہوں۔ مجھے تو اس نے ٹکا سا جواب دیدیا تھا۔ بہت اچھا ہوا وقت پر عزت رہ گئی۔

دیکھتے دیکھتے مصائب کے بادل چھا گئے۔ اسی شام بچہ بیمار پڑ گیا۔ رات بھر تکلیف سے کراہتا رہا۔ تمام مہمان اللہ سے دعائیں مانگتے رہے۔ امراؤ بیگم نے بکرے صدقے کئے۔ حکیم آکر سرہانے بیٹھ گئے۔ لیکن بچے کو افاقہ نہ ہو رہا تھا۔ حکیم صاحب نے بچے کے سر کے بال منڈوا کر صندل کا لیپ کروا دیا۔ کیا کیا جتن نہ کئے ادھر صبح کی اذان ہوئی۔ ادھر بچے نے دم توڑ دیا۔ گھر میں ایک کہرام مچ گیا۔ یہ غم مرزا صاحب کے لئے بہت سخت تھا۔ بیگم کو بچے کے حادثہ نے وہ داغ دیا۔ جیسے ان کا سب کچھ چھین لیا۔ لے دے کے بیچاری کی آرزوؤں کا ایک ہی مرکز اور دل بستگی کا ایک ہی سہارا تھا۔ سو وہ بھی اب تا رہا۔

بچے کا قُل کر کے مہمان واپس ہوئے۔ امراؤ بیگم اپنے والد سے لپٹ کر دہاڑیں مار مار کر روئی۔ اس کا کلیجہ پھٹ گیا تھا۔ اس کی دُنیا اُجڑ گئی تھی۔ اس کا چمن ویران ہو گیا تھا۔ اس کے صحنِ زندگی میں جھاڑو پھر گئی تھی۔

مرزا نے اس صدمے کو اپنے لئے گوارا بنانے کے لئے کوشش کی اور بیگم کی دلداری شروع کی اب مرزا نے زیادہ وقت اندرون خانہ گذارنا شروع کر دیا۔ خورشید بھی بلوان کو ساتھ لیکر افسوس کے لئے آئی۔ رام کلی بھی اماں کے ساتھ فاتحہ کے لئے پہنچی۔ الٰہی جان بھی وفات پر پُرسے کے لئے گھر آئیں۔ اور خوب رو دھو کر مرزا کی اشک شوئی کی۔ نائیکہ نے مرزا کو دلاسے دیئے اور کہا کہ بیگم کے پہلو سے لگ کر آپ کا غم غلط نہ ہوگا۔ بلکہ یہ غم تو آپ کو پاگل کر دیگا۔ اور بیگم کو بھی دیوانہ بنا دے گا۔ آپ کا غم تو الٰہی جان کے پہلو میں ہی غلط ہو سکتا ہے۔ مرزا صاحب نے اُسے ٹالا۔ بیگم کی تنہائی کا عذر کیا اور وہاں کی آمدو رفت موقوف کی۔ نائیکہ بڑی چالاک تھی۔ اس نے شہر کے کوتوال سے الٰہی جان کا میل جول کرا دیا۔

وہ جانتی تھی کہ مرزا کو یہ رقابت گوارہ نہ ہوگی۔ اور وہ گھر کے قفس کی تیلیاں توڑ کر شاخ الٰہی جان پر آن بیٹھیں گے۔ اور وہ رشک سے بے تاب ہو کر رہیں گے۔ کوتوال شوقین مزاج تھا۔ الٰہی جان پر قربان ہوگیا۔ اور اس نے دولت کی بارش شروع کر دی۔ اب نائیکہ نے بیٹی کو دولت کے انبار دکھائے۔ اور مرزا صاحب کی طرف سے طرح طرح کی باتوں سے بہکانا شروع کیا۔ اور طعن دیکر دِر غلایا کہ ایک خاندان کے رئیس زادے پیسے سے ہار گئے۔

دیکھو کوتوال صاحب کتنے اچھے ہیں یہی انداز رہے تو چار

دن میں سونے کے محل بنوا دیں گے تو بھی عجیب پگلی تھی۔ اس نگوڑے پر جان چھڑکتی تھی۔ اور کنگلے سے نکاح کرنے پر تیار ہو گئی تھی۔ تو نادان ہے اپنے پیشے کی ریت نہیں جانتی۔ ہمیں عشق سے کیا واسطہ ہمیں عاشقی سے کیا تعلق۔ چار دن نئے سوداگر سے میل جول بڑھایا لوٹ کھسوٹ سے غرض رکھی پھر کسی تازہ دم کو تلاش کر لیا۔

الہی جان نائیکہ کی باتیں سُن رہی تھی۔ اور خاموش تھی۔ وہ جانتی تھی کہ حالات میرے خلاف ہیں۔ کچھ کہا تو قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ بات بگڑ جائے گی۔ اس نے مرزا کو شکایت آمیز پیام بھیجا کہ آپ کے تغافل نے میری جان و آبرو پر بنا رکھی ہے۔ آخر آپ نے میری خبر نہ لی تو یاد رکھئے کہ آپ کے جورِ بے جا کی وجہ سے جان گنوا دوں گی اور پھر ؏

یاد آئے گی تمہیں میری وفا میرے بعد

مرزا کا خیال تھا کہ الہی جان بھی اس بازار کی کمینہ خصلت حسینہ ہے۔ یہ سب لوگ مطلب پرست ہوتے ہیں۔ عشق و محبت دکھاوے کی کرتے ہیں۔ لوٹ کھسوٹ کر الگ ہو جاتے ہیں۔ لیکن الہی کے اس پیغام نے مرزا کی خاک میں دبی ہوئی چنگاری کو شعلہ بنا کر چھوڑا۔ مرزا نے اعتمادِ وفا کر کے از سرِ نو تجدید محبت کا ارادہ کر لیا۔ کوتوال کے مخبر کارکنوں نے خبر کی کہ مرزا اسد اللہ خاں پھر الہی جان کے کوچے کی طرف آنے کا ارادہ کر رہا ہے۔ کوتوال کو رقابت سخت ناگوار تھی۔ اس کے ایک کارکن نے مرزا کے دیوان خانے کے شطرنج اور چوسر کی محفلوں کا ذکر کیا اور رائے دی کہ مرزا پر قمار

بازی کا الزام لگا کر اسے قید خانے میں ڈلوا دیا جائے اور اسے شرفاء کی نظروں میں ذلیل کر دیا جائے۔"

کوتوال کو رائے تو پسند آئی۔ مگر وہ مرزا کے خاندانی وقار سے بھی باخبر تھا۔ دہلی کے نوابوں کا حال بھی معلوم تھا۔ چنانچہ اس کے نزدیک یہ کام آسان نہ تھا۔ مرزا ایک شب دیار یار تک پہونچ ہی گئے الہی کے گھر کو دیکھا تو نقشہ ہی بدلا پایا۔ ہر کمرے کی دیواریں آراستہ نظر آئیں غالیچے اور چاندنیاں بچھے ہوئے دیکھے۔ گھر کے سازوسامان کے ساتھ نائیکہ کی نگاہیں بھی بدلی ہوئی تھیں۔ لیکن الہی جان کو پہلے سے بھی زیادہ اپنی جانب ملتفت پایا۔ مگر مرزا نے بہت سوچا اور فیصلہ کیا کہ اس کوتوال کا مقابلہ ہم سے نہ ہو سکے گا۔ یہ شہر کا کوتوال چاہے تو اشرفیوں کی بوریاں بھر کر یار کے گھر پہنچا دے ہم مقابلہ کریں تو کس برتے پر۔ لیکن یہاں سے یوں لوٹ آنا بھی خلاف وضع داری تھا۔ اب مرزا کا ہاتھ بیگم کے زیور تک پہنچا۔ مرزا کے قدیم ملازمین بھی کلو داروغہ اور کلیاں بچپن سے ان کے گھر کے پرورش یافتہ اور وفادار رفیق تھے۔ کلو پر مرزا کو زیادہ اعتماد تھا۔ چنانچہ وہی الہی جان کے گھر پیام و سلام لے جانے میں کام آتا تھا۔ اگرچہ اس کا دل کڑھتا تھا۔ مگر زبان سے کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔ کلو ہی اندرون خانہ کے کاروبار چلانے کا ذمہ دار تھا۔ اب جو بیگم کے زیور رہن رکھنے کا وقت آیا تو کلو کا دل تڑپ گیا۔ مگر کیا مجال کہ ادھر کی بات اُدھر یا اُدھر کی بات ادھر کہتا سنتا۔

مرزا کے ذاتی اخراجات پھر بڑھ گئے تھے اور زیادہ خرچ شراب پر اٹھتا تھا۔ جسے کم کرنے کے لئے کئی بار سوچ چکے تھے۔ ارادہ بھی کر چکے تھے۔ لیکن سب بیکار۔ اخراجات روز افزوں ترقی پر تھے۔ اندرون خانہ میں بی وفاداران عزت بیگم کے زمانہ سے تھی۔ وہ واقعی بڑی وفادار خادمہ تھی۔ مرزا اور بیگم دونوں ہی اس کا لحاظ و احترام کرتے تھے۔ گھر کے تمام کام کاج بی وفاداران کے سپرد تھے۔ اور باہر کی نگرانی کلو کے سپرد تھی۔ یہی دونوں گھر کے بھیدی تھے۔ کلیاں صرف ایک خدمت گذار تھا۔ وفادار ملازموں کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں۔ اور کس طرح گھر کی آبرو بچائیں۔ عزت بچائیں اور وقار قائم رکھیں انہوں نے باہم مشورے کئے کہ کس طرح مرزا کو الٰہی جان کے جال سے نکال لائیں۔ لیکن کسی کی ہمت نہ تھی کہ مرزا کے سامنے ایک لفظ بھی زبان پر لے آئیں۔ نہ ہی بیگم سے کسی قسم کا تذکرہ کر کے اپنے آقا کی سبکی گوارا کر سکتے تھے۔ بنسی دھر اور میر نے ان خاص ملازموں سے کہا کہ تم ہی اپنے مرزا جی کو روکو۔ لیکن ہر ایک نے جواب عرض کیا کہ ہم محض خدمت گار ہیں۔ مشیر کار نہیں۔ ادھر کوتوال نے مرزا کو نیچا دکھانے کی کوشش تیز کر دی۔ سوغات پر سوغات بھیجنا شروع کیا۔ تحفہ تحائف آنے شروع ہوئے۔ ہفتہ عشرہ نت نئے کپڑے سل کر آجاتے۔ موسم موسم کے پھل ٹوکرے بھر بھر کر آرہے تھے۔ نائیکہ پہلے ہی اس کی طرفدار تھی ایک روز کوتوال نے نائیکہ سے کہا۔

کوتوال: اماں تم نے مجھ کو کئی بار کہا ہے کہ مرزا کو چھٹا دوں گی۔ آخر ایسی کیا مجبوری ہے کہ تم کچھ نہیں کر سکتیں۔

نائیکہ: حضور کیا کروں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ بہت جتن کر دیکھے ہیں۔ مگر یہ مرزا عجیب ڈھیٹ ہے۔

کوتوال: نہیں بلکہ دل سے مجبور ہے۔ اور الٰہی جان اپنی محبّت سے۔

نائیکہ: نانا حضور۔ یہ کیا فرمایا آپ نے۔ الٰہی جان محبت کے قصّے کیا سمجھے۔ اس کی عمر ہی کیا ہے۔ وہ چاہت واہت کے جھگڑے کو جانے۔ اور پھر اس کی کیا مجال کہ میری مرضی کے خلاف کسی سے آنکھ ملا کر بات بھی کرے۔

کوتوال: میں جانتا ہوں۔ تم بہت سمجھدار ہو اسی لئے دونوں طرف کا خیال رکھتی ہو۔"

نائیکہ: حضور کے قدموں کی قسم۔ اصل سے نہیں جو حضور سے دغا کروں خدا لگتی کہتی ہوں۔ مرزا تو مفت میں بٹیا کے گلے پڑا ہوا ہے الٰہی خود تنگ آئی ہوئی ہے کیا کریں۔ دھتکارا بھی تو نہیں جاتا۔

کوتوال: واہ یہ بھی کوئی بات ہے۔ بھلا کسی کے گھر کسی کی زبردستی چل سکتی ہے۔ کسی کو حق ہی کیا حاصل ہے کہ بغیر اذن کسی کے گھر قدم رکھے۔

نائیکہ: حضور تو جانتے ہیں کہ یہ کسی شریف کا گھر تو ہے نہیں کہ کسی کے آنے جانے میں روک ٹوک ہو۔

کوتوال: فرض کرو الہی جان کسی کی پابند ہے۔ پردہ کرتی ہے۔ کسی کے سامنے نہیں ہو سکتی۔ پھر کوئی سامنے کیوں آئے۔

نائکہ: جی ہاں یہ بات اور ہے۔

کوتوال: تو بس آج سے ہر آنے والے سے صاف کہدو کہ الہی جان کسی کی ہو چکی ہے۔ اب یہاں کسی کو آنے کی اجازت نہیں ہے۔

نائکہ: جی بہت اچھا — وقت اسی طرح گذرتا چلا گیا۔

ایک روز کلو اور بی وفادارن نے تنہائی میں بیٹھکر کچھ ایسی سرگوشیاں کیں کہ بی وفادارن سُن کر گھبرا گئی۔ اور سر پیٹ کر بولی۔ آئے اللہ تمہارے منہ میں خاک۔ داروغہ جی اب کیا ہوگا۔ اب کیا کیا جائے کلو نے کہا۔ میں خود تم سے مشورہ لے رہا ہوں۔ میری سمجھ میں کچھ آتا تو تم سے مشورہ کیوں لینا۔ وفادارن نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ تم نے تو مجھے خبر ہی ایسی سُنائی ہے کہ جی ہول گیا ہے۔ اللہ بخشے۔ بڑی بیگم نے مرزا نوشہ کی شادی ہی اس لئے کی تھی کہ وہ ایسی ویسی باتوں سے بچ جائیں گے۔ اور یہ سارے امیرانہ مشغلے ختم ہو جائیں گے۔ پر داروغہ جی یہ تو اور ہی لینے کے دینے پڑ گئے۔ کلو نے کہا۔ یہ سوچو اب کرنا کیا چاہیئے۔ وفادارن نے کہا۔ یہ تو میں جانتی نہیں پر اتنا جانتی ہوں کہ بہو بیگم پر جان نثار کردوں گی۔ لیکن مرزا کو گھر میں وہ چنڈال ڈومنی نہ لانے دوں گی۔ غضب خدا کا۔

لو اور سُنو۔

★

کلو نے کہا، یہ بھرا تباہ ہو گیا۔ ایک ایک کر کے سب بزرگ خاک میں پنہاں ہو گئے۔ ایک بچہ گھر کی رونق کا باعث بنا تھا۔ وہ بھی خدا کو پیارا ہو گیا۔ بس اب تو اک شمع رہ گئی ہے۔

وفادارن نے ہلکے سے کہا ؎

سو وہ بھی خموش ہے۔"

★

جلتے ہیں داغ حسرت وارماں لئے ہوئے

نائیکہ نے کوتوال سے ہاں تو کرلی تھی۔ لیکن ہاں کر کے وہ ایک عجیب خلجان میں پڑ گئی تھی۔ نہ مرزا کو طوطا چشم سے روک سکتی تھی نہ کوتوال کے خلاف جا سکتی تھی۔ وہ رات بھر نہ سو سکی۔ کیونکہ کوتوال اپنے مطالبہ میں شدت اختیار کر گیا تھا۔ اور آج نائیکہ کو حتمی فیصلہ کرنا تھا۔ اس نے تدبیر سوچی کہ آج مرزا آئیں تو انہیں صاف اور واضح الفاظ میں کہدوں کہ اگر وہ الہی جان کا ایسا ہی دم بھرتا ہے تو اس سے نکاح کر لے ورنہ کوتوال

سے نکاح ہو رہا ہے۔
دن گذر گیا شام ڈھل گئی تو مرزا صاحب بن ٹھن کر الہی جان کے ہاں گئے۔ الہی جان کو ماں کی سازش کا مطلق علم نہ تھا۔ نائیکہ جانتی تھی کہ مرزا خاندانی وقار کا مالک ہے وہ شادی شدہ بھی ہے اور سسرال والے بھی کوئی ہلکے پھلکے نہیں ہیں۔ دلی کے خاندانی نواب ہیں اور نواب بھی وہ جنہیں سرکارِ دربار سے کرسی ملتی ہے۔ جب اُن سے بیاہ کا ذکر چھیڑا گیا تو خاندانی وجاہت شرافت کا لحاظ رکھتے ہوئے صاف انکار کردیں گے۔ اور اس طرح ان کی محبت کا بھرم کھُل جانے سے الہی جان اپنے پندار کی شکست پر ہم سے آنکھ ملا کر بات نہ کرسکے گی۔ اور پھر لامحالہ وہ کوتوال کی طرف راغب ہونے پر مجبور ہوگی۔
نائیکہ مرزا کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ الہی جان بھی وہیں بیٹھی ہوئی تھی۔ نائیکہ نے کہا۔
نائیکہ: مجھے آج حضور سے بہت ضروری بات کرنا ہے۔
مرزا: بات ضروری ہو یا غیر ضروری جب کرنی ٹھہری تو پھر اذن کیسا۔!
نائیکہ: حضور کو تو علم ہی ہے کہ شہر کے کوتوال یہاں آتے ہیں۔ الہی جان کو دل و جان سے چاہتے ہیں۔ وہ اس پر ریجھ گئے ہیں۔ نکاح تک بات پہونچ گئی ہے۔ لیکن میں نے صاف کہہ دیا تھا کہ نا

بھئی ہم مرزا صاحب کے نمک خوار ہیں۔ اس گھر میں پہلے ان کا قدم بعد میں کسی دوسرے کا۔ میں جانتی ہوں کہ آپ الہی جان سے محبت کرتے ہیں۔ الہی جان کو آپ سے عشق ہے۔ ادھر کوتوال الہی جان کی تمام ذمہ داریاں اٹھانے پر رضامند ہیں۔ میں اس گھر سے عشق و عاشقی کا جھگڑا ختم کرنا چاہتی ہوں۔ اگر آپ الہی جان کو اپنے لئے پسند فرماتے ہیں۔ تو الہی جان کا ہاتھ تھام کر اپنے ہاں لے جایئے۔ اگر یہ کسی طرح سے ممکن نہ ہو تو پھر الہی جان کو اجازت بخش دیں کہ وہ کسی دوسرے کی ہو جائے۔"

نائیکہ کے یہ جملے سُن کر مرزا پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ الہی خود پریشان تھی کہ کیا کرے کیا نہ کرے۔ مرزا گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ معاملہ کوئی معمولی نوعیت کا نہ تھا۔ دو خاندانوں کے وقار کا سوال تھا۔ بے گناہ امراؤ بیگم کی زندگی کا سوال تھا۔ اور پھر اپنے پورے مستقبل کا سوال تھا۔ الہی نے کہا۔ خاموشی اس کا حل نہیں سوچ سکتی مرزا جی۔

مرزا نے کہا۔ ہمیں کچھ سوچنے دو جانِ اسد!

نائیکہ نے کہا: جلدی مت کرو لاڈلی۔ یہ وہ بات نہیں جس کا تعلق دولت سے ہو۔ یہ وہ بات ہے جس کا براہِ راست تعلق زندگی سے ہے۔

مرزا نے کہا۔ ٹھیک کہتی ہو تم۔ ہمیں سوچنا پڑے گا۔ سب کچھ سوچنا پڑیگا۔ بلکہ بہت کچھ سوچنا پڑے گا۔

الہی جان نے سُسکنا شروع کیا۔ چالاک آنکھوں میں مکار آنسو

چھلکائے پلکوں پر منڈکائے پھر گالوں پر ڈھلکائے۔ اور پھر کہا میں نے تو سوچا تھا۔ کہ بس مرزا جی کی ہو چکی ہوں اور مستقل طور سے رہوں گی۔ خاکم بدہن اگر خواب کی تعبیر الٹی نکلی۔ تو میں روز محشر محبت کو کیا جواب دوں گی۔ عشق کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ اہل دل دنیا میں بھی مجھ پہ لعنت بھیجیں گے۔ کہیں گے آخر ہیچ نکلی۔ کوٹھے دار تھی نا۔ میراثن ذات سے وفا کی امید باندھنا محض ایک حماقت ہے۔ جو سنے گا۔۔ یہی کہے گا ؎

ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

میں مفت میں بدنام ہو جاؤں گی۔ میرے دامن پر بے وفائی کا داغ لگ جائے گا۔ میرے گھر کے نسب ناموں کے دامن سے لعنتیں باندھ دی جائیں گی۔ کوئی بھی تو میری بات نہ سنے گا۔ کوئی بھی تو مجھے بے گناہ نہ ٹھہرائے گا۔ میں نے جنم ہی ایسے گھر میں لیا ہے میں نے پرورش ہی ایسے ماحول میں پائی ہے۔ ہر کوئی میرے سونے کو پیتل ہی کہے گا۔

الہی دل کی بھڑاس نکال رہی تھی۔ اور مرزا جی سنتے جا رہے تھے آخر مرزا جی اُٹھ بیٹھے۔ الہی نے دامن گیر ہو کر کہا۔ بغیر کوئی فیصلہ کئے

چلے جائیں گے آپ؟ مرزا نے کہا۔ ہاں جان۔ ہمیں جانا ہی چاہیئے۔
الٰہی جان نے کہا۔ لیکن کِس ارادے سے! مرزا جی نے جواب دیا۔
کچھ سوچنے کے لئے۔ اچھا ہم کل آئیں گے۔

★

مرزا نے ساری رات دیوان خانے میں گذاری۔ صرف کھانا کھانے کے لئے بیگم کے پاس گئے وہ بھی بیگم کے بلانے پر اور پھر کھانے سے فارغ ہو کر فوراً ہی واپس دیوانخانے میں چلے آئے مرزا کی آنکھوں کے سامنے عشق و محبت کے سارے واقعات تصویریں بن کر چلتے پھرتے رہے۔ پتنگ بازی کے جلسہ سے لیکر کل شام تک کے واقعات ذہن میں گردش کرتے رہے۔ مرزا نے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ اپنے گھر کو دیکھا گھر کے حالات دیکھے نشیب و فراز پر غور کیا۔ اخراجات پر نگاہ ڈالی۔ جائداد کی ایک دیوار بھی رہن یا بیعہ سے فارغ نظر نہ آئی۔ سوچنے لگے کہ اگر الٰہی جان سے نکاح کی ہاں کر دیں تو بیاہ کے سامان کہاں سے لائیں گے اور پھر اسے لا کر رکھیں گے کہاں جائداد کا تو ایک کمرہ بھی باقی نہیں رہا۔ بیگم سے دھوکہ فریب کر کے اُس کا زیور بھی مانگ لیا۔ اُسی رقم سے شادی بھی ہوئی تو شادی

کے بعد کیا کریں گے۔

دام و درم ہمارے پاس کہاں
چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

★

اسی اُدھیڑ بن میں شب گذر گئی۔ وعدے کا دن طلوع ہوا۔ مرزا پر عجیب کیفیت طاری تھی۔ ادھر سے الہی جان کا ملازم آ گیا۔ مرزا کو جانا پڑا۔ الہی جان نے بڑی گرمجوشی سے مرزا کا استقبال کیا۔ مسکرا کر پوچھا۔ فرمایئے۔ حضور نے کیا فیصلہ فرمایا ہے۔ میرے لئے زندگی لائے ہیں یا موت؟ یہ سُن کر مرزا کے منصوبوں کی عمارت دھڑام سے گر گئی اور مرزا اُس کے ملبے میں دب کر مجبور و بے بس ہو کر رہ گئے۔ بولے۔ الہی ہماری جان ہے کوئی اپنی جان کو موت کا پیغام دے سکتا ہے۔ یہ سُنتے ہی الہی جان نے خوش ہو کر اماں سے کہا۔ اماں مبارک ہو۔ نائیکہ کا سُنتے ہی کلیجہ بیٹھ گیا۔ اُسے تو یقین تھا کہ مرزا جیسا خاندانی آدمی کو ٹھے کی رنڈی یا میراثن اور ڈومنی کو کبھی بھی اپنے نکاح میں لا کر اپنے خاندان کا فرد نہیں بنائے گا۔ اور وہ نائیکہ کو قوال سے بھی تو ہاں کر چکی تھی۔ مرزا کی ہاں نے اس کے منصوبوں پر بجلی گرا دی۔ وہ ایک بار تو اپنی جگہ سے ہل گئی۔ لیکن وہ بڑی مکار عورت تھی۔ اتفاق سے مرزا کا ملازم کلو ادھر آ نکلا۔ نائیکہ نے کلو کو مبارکباد دی کہ تمہارے

آغا ہمارے داماد بننے والے ہیں۔ انہوں نے الہی کو اپنے نکاح میں لے لینے کی ہاں کردی ہے۔ کلو یہ بات سن سن کر ششدر رہ گیا غم و غصہ کی آگ نے اُس کا کلیجہ جلا دیا۔

کلو واپس گھر گیا اور اس بے بی وفادارن سے ساری کہانی کہہ دی۔ وہ بھی سُن کر سخت پریشان ہوئی۔ اب یہ دونوں آپس میں طرح طرح کے منصوبے بنانے لگے۔ سوچنے لگے کہ اس آنے والے طوفان سے خاندان کو کیسے محفوظ رکھا جائے۔ ہم اس گھر کے نمک خوار پروردہ ہیں۔ بیگم کسی حال سے تا حال خبردار نہیں۔ ادھر نائیکہ نے تو آگ لگائی تھی۔ اس کی وجہ سے وہ مرزا کے گھر سے کسی نئے طوفان کے برپا ہونے کی منتظر تھی۔ مرزا صاحب رات گئے گھر واپس آئے اس وقت کسی نے مناسب نہ سمجھا کہ بات کو چھیڑا جائے۔ لیکن صبح ہوتے ہی دونوں ملازموں نے فیصلہ کیا کہ جاکر مرزا کے قدموں پر سر رکھ دیں اور جب تک اپنی بات نہ منوالیں۔ سر نہ اُٹھائیں۔ یہ فیصلہ کر کے وہ دونوں دیوان خانہ پہنچے اور جاکر مرزا کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ مرزا دیکھ کر گھبرا گئے اور پوچھا اس بدحواسی کا سبب کیا ہے۔ دونوں نے دوہائی دینی شروع کی کہ آپ جو کچھ کرنے والے ہیں۔ اس سے باز آئیں۔ ابھی کوئی بات بیگم کو معلوم نہیں ہوئی۔ لیکن ہم آپ کو ایسی کوئی بات نہ کرنے دیں گے جس سے خاندان کی عزت پر بٹہ لگے اور ہماری بے گناہ بیگم کی

جہنم بن جائے۔ مرزا نے پوچھا۔ آخر بات کیا ہے۔ کلّو نے کہا۔ بس حضور بہت ہو چکی۔ زیادہ بننے کی کوشش نہ کریں۔ ہم اُس ٹکے کی ڈومن کو اپنی عالی خاندان بیگم کی سوت نہ بننے دیں گے۔ مرزا نے ٹالنے کی کوشش کی اور پوچھا یہ تمہیں کس نے بتایا ہے؟ کلّو نے عرض کیا۔" آپ جہاں گئے تھے میں وہاں بھی گیا تھا۔ آپ نے جس بات کا عہد کیا ہے۔ مجھے اس کی مبارک باد مل چکی ہے۔ بی وفادارن نے کہا۔ اچھا حضور اگر یہ جھوٹ ہے تو ہمارے سر کی قسم کھایئے کہ یہ جھوٹ ہی رہے گا۔"

یہ لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ الہی جان بھی آگئی اور باہر دروازے سے لگ کر باتیں سنتی رہی۔ مرزا سخت پریشان تھے اور وہ دونوں ملازم روئے پیٹے جا رہے تھے۔ الہی جان کو گالیاں تک دے رہے تھے۔

مرزا نے تنگ آکر کہا۔ لو تمہارے سر کی قسم ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ یہ بات کسی دشمن نے اُڑائی ہوگی۔ بھلا ہم اس دو ٹکے کی کمینی ڈومنی کو تمہاری بیگم کی سوت بنانے لگے۔؟

لاحول ولا۔

مرزا کا جواب سُن کر الہی جان اندر آگئی۔ الہی جان نے ملازموں کے رونے پیٹنے کا سبب پوچھا۔ مرزا نے ٹلانے کی کوشش کی۔ ان کے رونے پیٹنے کی آوازیں سُن کر اندر سے امراؤ بیگم بھی گھبرا کر یہاں آگئی۔

بیگم نے دیکھا کہ دیوان خانے میں ایک غیر لڑکی بھی موجود ہے۔ بیگم نے مرزا کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔

مرزا نے کہا۔ بیگم تم یہاں کیوں چلی آئیں؟ کلّو نے کہا۔ بیگم کو آنا ہی چاہئے تھا۔ زنانخانہ میں بند رہ کر ان کی زندگی لُٹ چکی ہے اب جو پونجی رہ گئی ہے۔ اس کی حفاظت کے لئے انہیں دیوان خانے میں آنا ہی چاہئے تھا۔

بیگم نے حیرت سے پوچھا۔ کلّو ہم تمہاری بات نہیں سمجھے۔ بی وفادارن نے کہا۔ حضور ایسی باتیں سمجھ بھی نہیں سکتیں۔ آپ اس لڑکی کو پہچانتی ہیں کون ہے؟ بیگم نے الہی جان کو غور سے دیکھ کر کہا۔ نہیں مطلق نہیں۔"

کلّو نے کہا۔ تعجب ہے آپ اپنی ہونے والی سوت کو نہیں پہچانتیں۔

مرزا نے تلخ روئی سے کہا۔ بکواس بند کرو کلّو۔ دہن سے زبان کھینچ لی جائے گی۔ کلّو نے کہا۔ غلام نے زبان بند کرلی تو کیا ہوا۔ دُنیا کی زبانیں کیسے بند کرو گے۔ بیگم نے حیران ہو کر کہا۔ خدارا کچھ ہمیں بھی تو معلوم ہو۔

مرزا نے کہا۔ کوئی بات نہیں ہے بیگم۔ یہ آج کہیں سے نشہ پی آیا ہے۔ بیگم نے کہا۔ ہائے اللہ۔ کلّو کیا تُو نشہ کرنے لگا۔؟ کلّو نے رو کر کہا۔ میری بھولی شہزادی بیگم بات سمجھنے کی کوشش کریں۔

یہ لڑکی الہی جان ہے۔ یہ میراثن ہے۔ یہ وہی ہے جس نے مرزا کی شادی پر سہرا گایا تھا۔ یہ وہی ہے جس نے مرحوم بچے کی چھٹی پر مجرا کیا تھا۔ اور مردانہ میں جاکر ناچی تھی۔ اب ہمارے آقا اس ڈومنی کو اپنے نکاح میں لارہے ہیں۔ بات پکی ہو چکی ہے۔

یہ سن کر امراؤ بیگم کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس نے مرزا سے کہا۔ "سنیئے مرزاجی۔ آپ کی فضول خرچیوں میں جائداد رہن ہوتی رہی۔ میں نے کچھ نہ کہا۔ حویلیاں فروخت ہوگئیں میں نے اُف تک نہ کی۔ گھر نیلام ہوگیا۔ میں نے زبان نہ کھولی۔ آپ کا ہاتھ میرے زیور تک پہنچا۔ میں نے ہاتھ نہ روکا۔ اپنے گذارہ کے لئے میکہ والوں سے کسی بہانے مدد طلب کرتی رہی۔ لیکن آپ کی عزت جان سے زیادہ عزیز سمجھتی رہی۔ ان وفاؤں کا بدلہ یہ دے رہے ہیں کہ مجھ پر سوت لارہے ہیں۔ وہ بھی ایک بازاری ڈومنی۔ آخر کس گناہ میں۔ خاندان والے سنیں گے تو کیا کہیں گے میرے میکے میں بات پہنچے گی تو کیا حشر برپا ہوگا۔ مرزا نے کہا۔ بیگم تم ان جنڈالوں کی بات میں کیوں آگئی ہو۔"

الہی جان نے آگے بڑھکر بیگم کو سلام کیا اور کہا۔ حضور نے جو کچھ سنا ہے۔ لفظ بہ لفظ درست ہے۔ ہم دونوں کو آپس میں محبت ہے مرزا جی واقعی مجھے اپنے نکاح میں لانے کے لئے رضامند ہو چکے ہیں۔ میں یہاں ان سے ملنے آئی تھی کہ پیام کے بارے میں تفصیل سے

گفتگو کروں۔ یہاں آکر بات کا نقشہ ہی بدلا ہوا پایا ہے۔"

اچھا ہوا کہ وقت سے پہلے بات کھل گئی۔ ورنہ میرا کوئی ٹھکانہ نہ رہتا۔ پھر الہی جان نے مرزا سے مخاطب ہوکر کہا۔ مرزا جی آپ نے گھر والوں سے چھپا رکھا بہت برا کیا۔ آخر آپ نے مجھے اس گھر میں لانا تھا۔ اس وقت جو تماشہ ہوتا اُس کا کیا ہوتا۔ کلو اور بی وفادارن نے الہی جان کے قدموں پر سر رکھدیا اور کہا۔ ہماری گستاخی معاف کرنا۔ بی بی۔ ہم نے جو کچھ کہا ہے اپنے مالک اور مالک کے خاندان سے وفاداری کے طور پر کہا ہے۔ ہم آپ سے معافی مانگتے ہیں۔ الہی جان نے انہیں اُٹھاتے ہوئے کہا۔ میں تم دونوں پر خوش ہوں تمہاری وفاداری کی قدر کرتی ہوں۔ میں تم سے ہرگز خفا نہیں۔ بی وفادارن نے اُٹھ کر الہی جان سے کہا۔ آپ یقیناً مرزا میاں کی بربادی سے خوش نہ ہوں گی۔ الہی جان نے کہا۔ اگر میں مرزا جی کی تباہی کا تصور بھی کروں تو میری محبت پر ہزار لعنت۔

کلو نے جھٹ کہا۔ خدا آپ کو خوش رکھے بی بی۔ آپ ہمارے مالک کی بے عزتی کیوں چاہیں گی۔"

مرزا نے بیگم اور ملازموں کو زنانخانہ میں چلے جانے کے لئے کہا۔ تو الہی جان نے روک کر کہا۔ جی نہیں انہیں یہیں رہنے دیں۔ مجھے ان سے کچھ کہنا ہے۔ پھر وہ بیگم سے مخاطب ہوئی اور بولی۔ میں آپ کے دل کی بات کو سمجھتی ہوں۔ مجھ پر اعتماد کریں۔ اگرچہ میں ذات کی ڈومنی ہوں۔ لیکن اخلاق کی کمینہ خصلت نہیں ہوں۔ میں آپ کے سہاگ پر اور آپ کی

شرافت پر اپنی جان نثار کردوں گی۔ اس سے زیادہ میں نہیں جانتی وفا کیا ہے
پھر اس نے مرزا کو سلام کرتے ہوئے کہا۔ اچھا مرزاجی آپ کی عزت
آپ کا وقار سلامت رہے۔ میں جارہی ہوں۔ لیکن آپ کو مجھ سے ایک
وعدہ کرنا ہوگا۔ مرزا نے کہا۔ وہ کیا؟ الہی جان نے کہا؟ وعدہ کیجئے
کہ عمر بھر بیگم صاحبہ کو کبھی تکلیف نہ دیں گے اور اب میرے بعد کسی رنڈی
کو منہ نہ لگائیں گے۔ مرزا نے کہا۔ ہم وعدہ کرتے ہیں۔ پھر الہی جان سلام
کرکے چلی گئی۔ جاتے وقت آنکھوں میں آنسو بھر کر عجیب انداز سے مرزا
کو دیکھا۔

مرزا زنانخانہ گئے تو بیگم کو بڑی مایوس کیفیت میں پایا۔ مرزا پہلے ہی
اپنے کرتوت سے نادم تھے۔ بیگم سے مخاطب ہوکر بولے۔

مرزا: ہم بڑے گنہگار ہیں بیگم۔ ہم نے آپ کو بہت ستایا ہے۔
ہم آپ کا کوئی بھی تو حق ادا نہ کرسکے۔

بیگم: گھٹنوں میں سر دیکر خوب روئی جب جی ہلکا ہوا تو بولی میرا کچھ خیال
نہ فرمائیں۔ میں تو آپ کی کنیز ہوں۔

مرزا: نہیں بیگم اگر ہم آپ کے مالک ہیں تو آپ ہماری مالکہ ہیں۔ ہم ایک
مقدس اور پاکیزہ رشتے میں بندھے ہوئے ہیں۔

بیگم: شکریہ!

مرزا: دیکھو بیگم ہم نے آپ کے سامنے اپنی نازیبا حرکات کا اعتراف
کرلیا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ آپ کو ہماری خاطر کیا کیا سختیاں

نہ اٹھانی پڑیں۔

بیگم: اللہ پاک مجھے اس کی ہمیشہ توفیق دے۔ اور میں حضور کی فرمانبردار رہوں۔

مرزا: افسوس کہ ہم نے آپ کے معاملہ میں بڑی کوتاہی سے کام لیا ہے۔

بیگم: میری ایک خواہش ہے۔

مرزا: بخدا جلدی کہو۔ ہم اپنے تئیں خوش بخت سمجھیں گے۔

بیگم: وعدہ فرمائیں کہ خواہش پوری کریں گے۔

مرزا: دل و جان سے۔ آپ فرمائیں تو اظہار آرزو تو کریں۔

بیگم: میں چاہتی ہوں کہ ہم مستقل طور پر دہلی جا بسیں۔ اب یہاں کیا دھرا ہے۔ والدہ کا دم تھا، سو وہ اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ بچہ ایک کھلونا تھا۔ وہ بھی ٹوٹ گیا۔ اب یہاں میرا دل نہیں لگتا۔ یہ شہر تو مجھے قبرستان نظر آتا ہے۔

مرزا: ٹھیک ہے بیگم۔ ہمارا بھی آگرہ سے جی بھر گیا ہے۔ آپ سامان باندھنا شروع کر دیں۔ دو چار روز میں ہم سواری کا بندوبست کریں گے۔

یہ ۱۸۱۷ء کا زمانہ تھا۔ مرزا کے یار دوست خصوصاً بنسی دھر۔ بلوان سنگھ۔ میر صاحب اور خان صاحب مرزا صاحب کے ترک وطن کی خبر سن کر دوڑے آتے اور جدائی کے شکوے کرنے لگ جاتے۔ زنانخانہ میں بیگم کے ساتھ اس کے وفادار ملازم بیحد خوش تھے۔

بیگم نے ڈاک کے ہرکارے کو فوراً دہلی روانہ کر دیا۔ اور اپنے والدین کو اطلاع کی کہ ہم مستقل طور پر آگرہ چھوڑ کر دہلی آرہے ہیں۔

ادہر جب الہی جان کی ماں نے خود الہٰی کی زبانی مرزا سے شادی نہ ہونے کی خبر سُنی تو وہ الہی جان کو جلی کٹی سُنانے لگی کہنے لگی۔"

میرا تو پہلے ہی ماتھا ٹھنکا تھا۔ یہاں سے اُس کا خاموش چلے جانا بتا رہا تھا کہ اس کے پاس صرف لگاوٹ اور بناوٹ ہے پیار اور اقرار نہیں ہے۔ وہ بھلا کنگلا میری چاند بیٹی پری جمال کے ناز کیونکر اٹھا سکتا تھا۔ جو کچھ باپ دادا کی پونجی تھی۔ وہ کچھ خورشید کے چبارے پر لٹا دی اور کچھ رام کلی کے عشق میں خاک میں ملا دی۔ بچی کھچی شراب میں بہا دی۔ آخر میں یہاں آیا اور چار دن ہنڈیوں پر کام چلایا جب یہ بازار بھی بند ہو گیا۔ تو بیگم کے زیور کی طرف ہاتھ بڑھایا میں نے تو تمہیں سب کچھ سمجھا دیا تھا۔ نہ جانے تم کس چیز پر ریجھ گئی تھیں۔ چلو اچھا ہوا زہر پینے سے پہلے سونگھ لیا۔

الہٰی جان کی سخت ترش باتیں سُنتی جا رہی تھی۔ بہت ہو گئی۔ تو الہی جان نے کہا۔ مرزا نے ہرگز انکار نہیں کیا۔ میں خود اس رشتہ کو پسند نہیں کرتی۔ اس کے گھر میں پہلے سے بھولی سی بیگم ہے میں عورت ہو کر عورت پر ستم کیوں ڈھاؤں۔ میں اس کی آہیں کیوں لوں۔ ماں نے کہا۔ تم نے خیال بدل لیا اچھا کیا۔ کوتوال صاحب آ جائیں تو بیاہ کی تاریخ مقرر کرتی ہوں۔ الہٰی نے کڑک کر کہا۔ خبردار

اماں جو میرے سامنے اُس کوتوال کا نام لیا۔ مُوا بے غیرت ہے۔ جس کو اپنے بال بچوں کا خیال نہیں وہ کل کلوت کو میرا کیا خیال کرے گا۔ وہ تو اولاد والی ہے یہ ستم اپنی جھولی میں ڈال لیگی۔ وقت اس کی اولاد کو اُس کا سہارا بنا دیگا۔ میرا کیا بنے گا میرا کیا ہوگا۔ یہ ساری عیاشیاں نوکری کے بل بُوتے پر چل رہی ہیں۔ نوکری کا کھونٹا اکھڑ گیا تو۔ اُن بان کے سارے جھنڈے اکھڑ جائیں گے۔ ماں نے کہا۔ مرزا سے شادی پسند نہیں۔ کوتوال سے نفرت ہے پھر کرے گی کیا۔ الٰہی جان بغیر جواب دیئے اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

بلوان سنگھ نے جاکر خورشید سے ذکر کیا کہ ہمارے مرزا جی آگرہ چھوڑ کر دلی جا رہے ہیں۔ یہ سُن کر خورشید کو بہت صدمہ ہوا۔ اور وہ رام کلی کے پاس گئی اور اُسے مرزا کے ترکِ وطن کی خبر سنائی رام کلی کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ وہ دونوں اُسی شام مرزا سے ملنے آئیں۔ مرزا سے دیوان خانے میں باتیں ہوئیں۔ رام کلی نے رو رُو کر جان ہلکان کرلی۔ خورشید نے بھی جدائی پر ماتم کیا۔ مرزا کے غم میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ وہ دونوں رو دھو کر رخصت ہوگئیں۔

دوسری صبح مرزا نوشہ کا سامانِ سفر تیار ہوگیا۔ سب اہلِ وطن دوستوں۔ رفیقوں اور عہدِ طفلی کی یاد دلانے والے کوچہ و بازار سے رُخصت ہوکر وہ آخری بار الٰہی جان کے ہاں گئے۔ الٰہی جان کی ماں نے بڑی جلی کٹی سنائیں لیکن مرزا نے کوئی جواب نہ دیا۔ الٰہی جان نے عجیب

کیفیت کے عالم میں مرزا کا استقبال کیا۔ دونوں اس کوشش میں تھے کہ رنج وغم اور گلے شکوے کا اظہار نہ ہونے پائے۔ کسی پر دل کی گذری ظاہر نہ ہو۔ مرزا باتیں کرتے رہے۔ الہی جان نے کبھی منہ پھیر کر لب نازک کی کپکی کا اظہار نہ ہونے دیا۔ کبھی آنسوؤں کی لرزش چھپانے کی کوشش کی۔ الہی جان نے بصد مشکل کہا۔ آپ جہاں رہیں خوش رہیں۔ آپ کے پیاروں کو شادی مبارک اور نامرادوں کو بربادی مبارک ہو۔ مرزا نوشہ یہ سن کر تلملا اٹھے اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا الہی جان خدارا یہ نہ کہو ہماری مرضی میں تمہارا ارادہ بھی تو شامل ہے۔ الہی جان نے کہا۔ میرے ارادے کی بھی خوب کہی اور آنچل میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مرزا کے لئے یہ منظر قیامت خیز تھا۔ وہ چپ چاپ اس زہر کو پی گئے۔ الہی نے کہا۔ جلیئے آپ کو دیر ہو رہی ہے۔ گھر والے انتظار کرتے ہوں گے۔ کبھی یاد آؤں تو ڈومنی سمجھ کر یاد نہ کرنا وفادار سمجھ کر یاد کرنا ؎

مجھ کو مرنے کا تو افسوس نہیں ہے لیکن
کس کے گھر جائیگی کمبخت وفا میرے بعد

★

شاہجہاں سڑک پر مرزا کی سواری جا رہی تھی۔ سامان سے لدی ہوئی اونٹ گاڑیاں جا رہی تھیں۔ مرزا حسرت و یاس سے آگرہ کے

راستوں کو دیکھ رہے تھے۔ اچانک سڑک پر الہٰی جان نظر آگئی۔ الہٰی جان نے آگے بڑھ کر گاڑی کو روک لیا۔ بیگم نے بی وفادارن سے کہا۔ پوچھو یہ کون ہے۔ کیا چاہتی ہے۔ بی وفادارن نے خود ہی عرض کیا۔ یہ وہی الہٰی ہے جس کا ہم پر بہت بڑا احسان ہے۔ الہی جان نے بیگم کو سلام کرتے ہوئے کہا۔ غم نہ کریں۔ میں کسی کا راستہ بدلنے نہیں آئی۔ آخری دیدار کرنے آئی ہوں۔ چند لمحوں کی مہلت دیجیے۔ تاقیامت احسان مند رہوں گی۔ مرزا نے کہا۔ کہو الہٰی کس لئے آئی ہو۔ الہٰی نے کہا۔ جی چاہا تھا۔ کہ پھر ایک بار مل لوں۔ تاکہ دوبارہ ملنے کی حسرت نہ رہے۔ آپ کو اپنے شعر سنانا چاہتی ہوں۔ سُنئے۔"

غزل

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا!
دل جگر تشنۂ فریاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر تیرا وقتِ سفر یاد آیا
زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی
کیوں ترا راہ گذر یاد آیا!
آہ وہ جرأت فریاد کہاں
دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا

پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال
دل گم گشتہ مگر یاد آیا

★

الٰہی جان نے ہزار بیتابیوں کے ساتھ یہ شعر سُنائے۔ مرزا نے کہا۔ غزل کا ایک شعر ہم سے سُن لیجئے ؎

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

اور کہا۔ ہم یہ غزل مکمل کر کے آپ کو بھیجیں گے۔ الٰہی جان نے کہا۔ اب تو ہم قیامت کو ملیں گے۔ مرزا نے فوراً جواب میں کہا ؎

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

الٰہی گھر سے زہر پی کر آئی تھی۔ اب اس کے قدم زمین پر نہیں جم رہے تھے۔ وہ اپنا ہاتھ ماتھے تک لے گئی۔ وہ گاڑی سے الگ ہو گئی۔ اس کے خیالات پریشان تھے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ مرزا نے گاڑی بان کو حکم دیا۔ چلو بھئی گاڑی

ہانک دو۔ گاڑی چلتی چلی گئی۔ بہت دُور چلی گئی حتیٰ کہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ الہیٰ نے گاڑی کے پہیے کی لکیر پر سر رکھ دیا اور مرنے سے پہلے یہ شعر کہا ے

جان تم پہ نثار کرتے ہیں
ہم نہیں جانتے وفا کیا ہے

---★---

اسد اللہ خاں تمام ہوا

مرزا نوشہ کو اپنی سسرال دہلی آئے ہوئے دس گیارہ برس گذر گئے ۱۸۲۷ء کا زمانہ ہے مرزا کی عمر تیس برس ہو گئی ہے۔ اس اثناء میں مرزا نے اسد تخلص چھوڑا اور غالب اختیار کیا۔ کہتے ہیں دہلی میں اس تخلص اسد کے کوئی دوسرے شاعر بھی تھے۔ جو نہایت بھونڈے شعر کہتے تھے۔ کچھ لوگوں نے اس کے شعر مرزا سے منسوب کر کے مرزا کی عظمت کو رسوا کرنا چاہا اور مرزا کے شعر اس سے منسوب کر کے اس کا رتبہ بلند کرنا شروع کیا۔ مرزا کو معلوم ہوا۔ تو پریشان ہوئے اور فیصلہ کیا کہ اسد تخلص ہی ترک کر دیں گے۔ چنانچہ اسی شام دوستوں کو ایک دعوت دی گئی اور غالب تخلص کا اعلان کر دیا۔

رت آئی رت گئی زمانہ بدلا۔ ایک دنیا بدل گئی۔ حالات کچھ کے کچھ ہو گئے۔ الہٰی جان اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئی۔ مرزا کو ایک اور داغ مفارقت ملا۔ الہٰی جان کی موت نے مرزا کے

تخلیات میں ایک طوفان پیدا کر دیا۔ یہ داغِ حسرت آفتابِ سخن بنکر چمکا۔ غالب علم و فن میں طاق ہوئے۔ شہرۂ آفاق ملا۔ عربی فارسی اور اردو زبانوں پر قدرت رکھنے لگے۔ نجوم و تصوف اور فلسفہ و منطق میں بھی کافی علم حاصل کر لیا۔ اب مرزا غالب کو فنِ طب سے بھی آگاہی ہے۔ اب وہ مرزا اسد نہیں رہے۔ غالب ہو گئے ہیں۔ پرانی چیزیں نظرِ ثانی کے بعد بطور تبرک رکھ لی گئی ہیں۔ ان کے نزدیک اس دور کا کلام بھی ناپختہ کلام تھا۔ جسے ضائع کر دیا گیا۔ اب پروازِ تخئیل کی حد ادراک ستاروں سے آگے ہے۔ اب عالم مہر و ماہ طائرِ فہم و ادراک کے زیرِ پا ہے۔ فکر اوج ثریا کا ہم نشین ہے ؂

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

★

دہلی میں مرزا کا خیر مقدم بڑے جوش و خروش سے ہوا۔ سسرال والوں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ بیٹی اپنے پاس آگئی ہے۔ اور داماد نوکر چاکر نہیں تو لائق فائق تو ہے۔ جس کے کمالات کے چرچے دلی کے گرد و نواح میں ہو رہے ہیں ۱۸۲۷ء میں نواب معروف یعنی مرزا غالب کے خسر نے وفات پائی ان کے بیٹے مرزا علی بخش خاں جو شاعر بھی تھے رنجور تخلص رکھتے تھے۔ مرزا کے ہم ذوق اور ہم خیال ہونے کے سبب

ان سے بہت گھل مل گئے تھے۔ وہ عمر میں مرزا سے چند برس چھوٹے تھے۔ انہوں نے مرزا غالب کی رہائش کا عمدہ بندوبست محلہ بلی ماران گلی قاسم جان میں کر دیا۔ اپنا ایک مکان مرزا کو مستقل طور پر دیدیا۔ اخراجات کا بیشتر حصّہ بھی اپنے ذمہ لے لیا۔ تاکہ بہن اور بہنوئی کی شان و شوکت میں فرق نہ آنے پائے۔ مرزا غالب کا ایک نیا علمی حلقہ پیدا ہوا۔ شطرنج اور گنجفہ کی پرانی دلچسپیوں میں پھر دل لگانا چاہا۔ بیگم کے خاندان سے اختلاط، اخلاق کے تعلقات پیدا کیے۔ مے نوشی کے شغل میں کبھی کمی نہ آئی۔ باقی تمام عیاشیوں سے قریب قریب قطع تعلق کر لیا۔

دہلی کے مشاعروں میں اُردو کا رواج عام تھا۔ چنانچہ مرزا کو بھی اس طرف رجوع کرنا پڑا اور فارسی کی بجائے اُردو میں غزلیں کہنے لگے لیکن مرزا کی اُردو غزلیں فارسی زبان میں رچی ہوئی تھیں۔

یہی سبب تھا کہ مشاعروں میں مرزا غالب کی کچھ زیادہ قدر افزائی نہ ہوئی آخر تنگ آ کر عام مشاعروں کی شرکت سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ بس چند مخصوص احباب سے لطف اندوز ہو لیتے۔ ان نئے دوستوں میں مفتی صدر الدین آزردہ، مولوی امام بخش صہبائی، مولانا فضل حق خیر آبادی، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، مولوی مظہر علی اور چند ارباب علم و فن شامل تھے۔

مخصوص محفلوں میں یہ سب احباب شریک ہو جاتے تھے اور باہم شعر و ادب کے چرچے رہتے تھے۔ حتیٰ کہ مرزا صاحب کے مکان کا دیوان

خانہ علم و فضل کا مرجع بن گیا۔"

کچھ احباب مرزا کی خاطر رقص و سرور کی محفل آراستہ کرتے جس میں مرزا صاحب قند مکرر کے لطف حاصل کرنے شریک ہو جاتے اس سے بیتے دنوں کے داغ تازہ ہو جاتے۔ خورشید کی حسرت عشق یاد آ جاتی۔ رام کلی کی محبوب ادائیں تڑپا جاتیں اور الہیٰ جان کی سوز وفا بھڑ رلا جاتی۔ رنج و حسرت کے باوجود مرزا صاحب بزلہ سنجی اور شگفتہ بیانی میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔

لطائف و ظرائف کا یہ عالم تھا کہ دوستوں کی صحبت سے الگ گھر میں بیگم اور دوسرے لوگوں سے ہنسی دل لگی کرتے نظر آتے۔ اس عرصہ میں مرزا کے ہاں کئی لڑکے لڑکیاں ہوئیں۔ مگر سال ڈیڑھ سال سے زیادہ کوئی بھی زندہ نہ رہی۔ مرزا کا گھر بے چراغ ہی رہا۔ افلاس نے بھی ساتھ نہ چھوڑا۔ غم و الم کو بھلانے کے لئے صرف مے نوشی کا شغل تھا ۔

مے ہی پھر کیوں نہ میں پیئے جاؤں
غم سے جب ہو گئی ہو زیست حرام

★

مرزا صاحب نے آگرہ کے زمانہ کی یاد میں عشرت رفتہ کا ماتم کرتے ہوئے ایک غزل کہی تھی۔

ع

غزل

وہ فراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
فرصتِ کاروبارِ شوق کسے
ذوقِ نظارۂ جمال کہاں
دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا
شورِ سودائے خط و خال کہاں
تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائیِ خیال کہاں
ایسا آساں نہیں لہو رونا
دل میں طاقت جگر میں حال کہاں
ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق
واں جو جائیں گرہ میں مال کہاں
فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وبال کہاں
مضمحل ہو گئے قوئے غالب
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

ایک روز مرزا صاحب کے ایک دوست نے محفلِ رقص و سرور کا اہتمام کیا مرزا صاحب کو باقاعدہ دعوت دی گئی۔ وہ تشریف لے گئے۔ ابھی مغنیہ کا طائفہ نہیں پہنچا تھا۔ صاحب خانہ نے مرزا پر فقرہ کسا اور کہا۔

بیا برادر آ ڈر سے بھائی

ٹھیک اس وقت مغنیہ آگئی تو مرزا صاحب نے صاحبِ خانہ سے کہا۔ حضرت اپنا شعر مکمل فرما لیجئے۔

اس کا مصرع ثانی یوں ہے:

بر نشیں مادر بیٹھ ری مائی

صاحب خانہ سُن کر خجل ہوئے۔ اور اپنی پوزیشن بچانے کی خاطر مرزا صاحب کو بذلہ سنجی کی خوب داد دی۔ اس کے بعد مغنیہ سنبھل کر بیٹھی تو صاحبِ خانہ نے کہا۔ مرزا صاحب آپ کی وہ غزل وصال کہاں جمال کہاں۔ خیال کہاں۔ ان بی صاحبہ کو یاد کرائی ہے۔ ذرا سنئیے یہ خوب گاتی ہیں۔ مرزا صاحب نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا سہ

تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائیٔ خیال کہاں

★

مغنیہ نے مرزا صاحب کی غزل خوب خوب پڑھی ایک ایک شعر کو خاص کیفیت اور ادا سے ادا کیا۔ حاضرین بڑے متاثر ہوئے مرزا صاحب بے تاب ہوئے۔ جوانی کے روگ کی نوحہ خوانی پر لہو رو رہے تھے۔ عجیب بات کہ جسقدر تنگ دستی زیادہ ہوتی گئی اُسی قدر مرزا کے فنی کمال کو عروج حاصل ہوتا گیا۔ جو مکان مرزا صاحب کے سالے نے عنایت فرمایا تھا۔ وہ بھی پہلے رہن ہوا پھر فروخت ہوا۔ اور لعد ازاں کرائے کے مکان میں رہائش شروع کی۔ مرزا صاحب کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف بیگ بھی آگرہ سے دہلی پہلے آئے تھے۔ ان کا بار بھی مرزا کے سر تھا۔ امراؤ بیگم نے اپنی اولاد کا غم بھولنے کے لیے اپنی ہمشیرہ آبادی بیگم کے لڑکے زین العابدین خان کو متبنیٰ کر لیا۔ مرزا غالب کو اس بچے سے بے حد محبت ہو گئی اور اس کی حقیقی اولاد کی طرح پرورش کی۔

جب تنگ دستی نے مرزا صاحب کا قافیہ تنگ کر دیا۔ تو عزیز و اقارب نے مرزا صاحب کو مشورہ دیا کہ اپنی پنشن کی بحالی کے لیے کلکتہ جائیں اور وہاں صاحب لفٹیننٹ گورنر کی خدمت میں عرضداشت گذاریں۔

★

مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دُور دُور

پنشن کا دعویٰ یہ تھا کہ مرزا غالب اور دوسرے اہلِ خاندان کو فیروز پور جھرکہ سے جو پنشن ملتی تھی وہ ابتدائی مقررہ رقم سے کم ہے۔ یہ کل رقم دس ہزار روپے سالانہ ہونی چاہئے تھی۔ لیکن فیروز پور جھرکہ والے تین ہزار روپیہ سالانہ دیتے تھے۔ جب تک اس ریاست کا بندوبست نواب احمد بخش خاں کے زیرِ اہتمام رہا۔ وہ پوری پنشن اور اس کے علاوہ بھی کچھ نہ کچھ مالی امداد کرتے تھے۔ لیکن ۱۸۲۶ء میں نواب صاحب نے ریاست کا انتظام اپنے صاحبزادے شمس الدین خاں کے حوالے کر دیا۔ ریاست لوہارو کا علاقہ اپنے دو بیٹوں امین الدین خان اور ضیاء الدین خاں کو سونپ دیا اور خود گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ شمس الدین خان نے بقیہ پنشن کی رقم بھی قطعی بند کر دی۔ کیونکہ مرزا غالب کو جو رقم ملتی تھی۔ وہ ریاست جھرکہ سے متعلق تھی۔ ۱۸۲۶ء میں خواجہ حاجی نے بھی وفات پائی اور شمس الدین خان کل جاگیر اور آمدنی وغیرہ کے مالک و مختار بن گئے۔ لیکن خواجہ حاجی کے

بیٹوں نے شمس الدین خان کی منت سماجت جاری رکھی۔ اور دونوں بیٹوں خواجہ جان اور خواجہ امان کو ان کی معاش ملتی رہی۔ اب مرزا غالب کا دعویٰ تھا کہ سرکار نے جو ہر گنے دیئے تھے۔ وہ دس ہزار سالانہ کے تھے۔ اور صرف ان کے چچا نصر اللہ بیگ خان کو دیئے گئے تھے اس لئے یہ رقم ان کو اور ان کے کنبے کو ملنا چاہئے۔ خواجہ حاجی کی مداخلت قطعی بے جا تھی۔ مرزا صاحب اپنی ساری تباہی کا موجب ہی حاجی خان کو گردانتے تھے۔ اور خواجہ جان اور خواجہ امان کو جو مراعات دی گئی تھیں۔ وہ غلط تھیں کیونکہ اس سے مرزا صاحب کی حق تلفی ہو رہی تھی۔

امراؤ بیگم نے مرزا صاحب کے سفر کلکتہ کے اخراجات کا بندوبست کیا اور انہیں کلکتہ روانہ کر دیا۔ شروع اپریل ۱۸۲۷ء میں مرزا صاحب دہلی سے کلکتہ کے لئے روانہ ہوئے۔ بیگم پر یہ وقت بڑا سخت تھا۔ شوہر کی جدائی کا صدمہ معمولی بات نہ تھا۔ روانگی سے قبل کئی روز تک خاندان کے لوگ مرزا سے ملنے آتے رہے۔ اور مرزا کے لئے امام ضامن اور صدقہ و خیرات لاتے رہے۔ وفادار بیوی نے سینے پر سل رکھ کر شوہر کو رخصت کیا۔ اُس وقت عجیب منظر تھا۔ گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ زین العابدین دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ مرزا شفقت سے دلاسے دیتے۔ پیار کرتے۔ جلد واپس آنے کا وعدہ کرتے۔ لیکن جدائی کا غم کوئی بات نہ سنتا تھا۔ روانگی کے کئی روز بعد تک بیگم نے رو رو کر آنکھیں سجا لیں۔ مرزا صاحب دہلی سے چل کر پہلے لکھنؤ

پہونچے۔

اس وقت شاہ نصیر الدین حیدر اودھ کے تاجدار تھے۔ مرزا صاحب کی آمد کی اطلاع پر انہوں نے وزیر اعظم معتمد الدولہ کو خیر مقدم اور شاہی مہمان داری پر تعین کیا اور بڑی خاطر و مدارات سے پیش آئے۔ وہ مرزا غالب کا لکھنؤ آنا باعث عزت سمجھ رہے تھے۔ مرزا کی دربار میں حاضری ہوئی۔ مرزا صاحب نے شاہ اودھ کی شان میں قصیدہ کہکر پیش کیا اور دربار اودھ سے خلعت و انعام حاصل کیا۔ شہر میں اساتذہ لکھنؤ نے شعر و سخن کی محفلیں آراستہ کیں۔ لکھنؤ میں مرزا غالب کی دھوم مچ گئی۔ اردو اور فارسی غزلوں نے مرزا کا سکہ بٹھا دیا۔ قدر دانوں نے باری باری اپنے ہاں مرزا کو مہمان بلایا۔ اور مخصوص محفل مشاعرہ کا اہتمام کیا۔ اس طرح اہلِ لکھنؤ مرزا کے کلام سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ کچھ ماہ قیام کر کے مرزا صاحب رخصت ہوئے۔ کانپور اور بنارس ہوتے ہوئے فروری ۱۸۲۸ء میں کلکتہ پہونچے۔ کلکتہ میں مرزا صاحب کے کئی مربی موجود تھے۔ مثلاً میر کرم حسین۔ میرزا احمد بیگ تپاں۔ ابوالقاسم قاسم۔ نواب اکبر علی خاں طبا طبائی اور مولوی سراج الدین احمد خاں۔ ان دوستوں نے مرزا صاحب کا خیر مقدم کیا۔ مرزا صاحب نے کسی دوست کے آستانہ پر قیام پسند نہ کیا۔ اور اپنی رہائش کا الگ انتظام کر لیا۔ اہل کلکتہ میں مرزا کی آمد کا چرچا ہوا۔ اسی زمانہ میں مدرسہ عالیہ کلکتہ میں ارباب علم و ادب کا مجمع تھا۔ ان میں سے اکثر مرزا سے ملنے آتے لیکن مرزا نے

ان میں سے اکثر کو منہ نہ لگایا۔ محض لائق حضرات سے ملنا پسند کیا۔ اس بے نیازی پر وہ لوگ سخت بدظن ہو گئے اور جگہ جگہ مرزا غالب کے بارے میں کہنا شروع کیا کہ مرزا غالب بڑا مغرور اور خودسر آدمی ہے۔ دلی کے لوگ ہوتے ہی ایسے ہیں۔ مرزا اہل کلکتہ کو خاطر میں نہیں لاتے وہ کسی شریف آدمی سے ملنا بھی پسند نہیں کرتے۔ ان باتوں سے مرزا کے خلاف شدید نفرت انگیز فضا پیدا کر دی۔ مرزا صاحب زیادہ تر ایرانی ادبا اور شعرا سے ربط و ضبط رکھتے تھے اور انہی لوگوں کو اہل زبان تصور کرتے تھے اور ان کی صحبتوں میں بیٹھنا باعث عزت سمجھتے تھے اور ان کے کلام فارسی سے محظوظ ہوتے تھے۔ حاجی عبدالکریم اصفہانی کلکتہ کے ایک بڑے سوداگر اہل ذوق صاحب علم بزرگ تھے۔ انہوں نے اپنے ہاں مرزا صاحب کے اعزاز میں محفل مشاعرہ منعقد کی کلکتہ کے شعرا نے اس میں شرکت کی آخر میں جب مرزا غالب نے فارسی غزل پڑھی تو مرزا کو چک ایرانی نے بھرے مجمع میں کہدیا کہ مرزا غالب کے مرتبہ کا شاعر آج سرزمین ایران میں بھی موجود نہیں ہے۔

ان کی یہ تعریف سن کر مرزا کے مخالف لوگ سخت برہم ہوئے چنانچہ مرزا کو نیچا دکھانے کے لئے مدرسہ عالیہ کے زیر اہتمام ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ مرزا صاحب وہاں مہمان خصوصی تھے۔ لیکن درپردہ ان کی مخالفت کے لئے صف آرائی کی گئی تھی۔ شعرا میں سے بعض نے کھلم کھلا ایسے شعر پڑھے۔ جن سے مرزا کے غرور پر چوٹیں کی گئی تھیں۔ مرزا

خاموشی سے سنتے رہے اور مسکراتے رہے۔ میر کرم حسین اور دیگر احباب نے مداخلت بھی کی۔ لیکن مرزا نے انہیں ہنس کر روک دیا۔ آخر میں مرزا صاحب نے فارسی غزل پڑھی۔

مخالفین کی صفوں سے داد کی جگہ شور و غوغا اٹھا۔ لیکن معتقدین تعریف کرتے رہے۔ مرزا نے یہ جب یہ شعر پڑھا ؎

خبرم از عالمم داز ہمہ عالم بیشنم
ہم چو موئے کہ بتاں را ز میاں برخیزد

ایک شخص نے اٹھ کر کہا۔ مہمل اور غلط شعر کو ہم برداشت نہیں کر سکتے" لفظ عالم مفرد ہے اس کے ساتھ ہم کا استعمال بے معنی ہے۔ اس کے لئے مرزا قتیل کی سند موجود ہے۔

مرزا صاحب نے جواب میں ہنس کر کہا۔ میاں آپ کو شاید قتیل نے ہلاک فریب کیا ہے۔ ہم عالم کی سند سعدی اور حافظ کے کلام میں موجود ہے۔ اساتذہِ زبان سے استناد ضروری ہے نہ کہ پادری کچوری کے تیلی سے ؟ اس پر مجمع کے اکثر لوگ برافروختہ ہو کر شور مچانے لگے ایک مخالف نے اٹھ کر کہا۔

جناب آپ کا کلام ہی سراسر مہمل ہے" زمیاں برخیزد" کی ترکیب درست نہیں ہے۔ استادِ فن مرزا قتیل سے سند حاصل کیجئے۔ اب مرزا غالب سے برداشت نہ ہو سکا بولے۔ میں فرید آباد کے کھتری بچہ کی سند نہیں جانتا۔ فارسی میں ؟؟ فیاض سے مجھے وہ دستگاہ

ملی ہے کہ اس زبان کے قواعد و ضوابط میرے ضمیر میں اس طرح جاگزین ہیں جیسے فولاد میں جوہر۔ فارسی میزان میرے ہاتھ میں ہے۔

اس پر مخالفین نے خوب ہنگامہ برپا کیا ان میں جہلا بھی شریک تھا۔ اگرچہ معقول لوگوں نے خاموش کرنے کی کوشش کی مگر شور و غل کرنے والے اکثریت میں تھے۔ چنانچہ ہنگامہ نہ دب سکا۔ اور جلسہ درہم برہم ہوگیا۔ مرزا صاحب کو اس سے بڑا دکھ ہوا اس کے بعد وہ جب تک کلکتہ میں رہے۔ کسی عام محفل میں شریک نہ ہوئے اعتراضات کا سلسلہ جاری رہا۔ کیونکہ ہم نوایانِ قتیل کا مقصد تو مرزا غالب کی مخالفت برائے مخالفت تھی۔ اس واقعہ سے مرزا کے مزاج میں تلخی آگئی۔ اور وہ کلکتہ کے چند روزہ قیام کو عمر بھر نہ بھولے۔ اپنی آخری زندگی میں ایک واقعہ پر مرزا غالب نے کہا ؂

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

دراصل یہ سفر پنشن کے مقدمہ کی خاطر گوارہ کیا تھا۔ چند انگریز حکام مرزا صاحب کے موافق تھے۔ چنانچہ کول بروک ریذیڈنٹ دہلی اور اسٹرلنگ سیکریٹری حکومت انگریزی نے غالب کے موافق رپورٹ پیش کی۔ لیکن گورنر جنرل نے فیصلہ کیا کہ یہ سند سرجان مسکیم کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ جو اس زمانے میں لارڈ لیک کے سیکریٹری تھے اور اس سلسلہ میں نواب احمد بخش خان کی گواہی ضروری ہے۔ لیکن نواب نے مرزا کے خلاف گواہی دی۔ خواجہ حاجی کا بھی انتقال ہو چکا تھا اور یہ مقدمہ اس کے بعد اس کی اولاد کے بھی خلاف تھا۔ مرزا غالب کو مغلیہ اندازِ حکومت سے کہیں زیادہ برطانوی طرزِ حکومت اور ان کے طور طریقوں سے خاصہ لگاؤ تھا۔ اور وہ انگریز کے محاسن کے دل سے گرویدہ تھے اور ہمیشہ مداح رہے مرزا کا یہ کہنا بالکل درست ہے۔

ع

"عمر گزری میری انگریز کی مدّاحی میں"

مرزا صاحب اپنے اچھے دوستوں کی بھی قدر کرتے تھے۔ کلکتہ میں ان کے دوستوں میں سے قاسم اور ستیپال بڑے مخلص دوست تھے۔ اس کے باوجود مرزا نے کسی دوست کے پاس ٹھہرنا گوارا نہ کیا اور شملہ بازار میں ایک مکان کرائے پر لیکر وقت گذار لیا۔ مرزا صاحب نے دونوں دوستوں کے بارے میں لکھا ہے۔

ع

ہم سخن اور ہم زبان حضرت قاسم تپاںؔ
ایک تمیش کا جانشین وردؔ کی یادگار ایک

ایک وفا و مہر میں تازگیٔ بساطِ دہر!
لطف و کرم کے باب میں زینتِ روزگار ایک

مرزا کو دو سال تک کلکتہ میں قیام کرنا پڑا۔ کیونکہ جب مقدمہ کونسل میں پیش ہوا۔ کونسل کے اراکین میں سے ایک خاص رکن ولیم بیلی طویل رخصت پر برما چلا گیا۔ اور مقدمہ کی سماعت التوا میں پڑ گئی۔ اس وقت حکومت ہند کا چیف سیکریٹری انڈریو اسٹرلنگ تھا۔ اس کی خدمت میں پچپن اشعار کا ایک طویل قصیدہ لکھ کر بھی پیش کیا۔

کلکتہ میں رہ کر مرزا نے بنگال کے اُردو شعراء کے کلام سے فائدہ اٹھایا۔ کسی شاعر کا ایک شعر مرزا کو یاد رہا اور کلکتہ سے واپس آ کر دوستوں کو سنایا ؎

تم کہتے تھے رات میں آئیں گے سو آئے نہیں
قبلہ بندہ رات بھر اس غم سے کچھ کھائے نہیں

ایک شب کرم حسین کے ہاں مرزا کی دعوت تھی۔ مخصوص احباب تشریف فرما تھے۔ پان سپاری کا دور چل رہا تھا۔ صاحب خانہ کی

ہتھیلی پر بڑی خوب صورت چکنی ڈلی تھی ۔ کرم حسین نے مرزا سے کہا دیکھئے مرزا صاحب اس ڈلی کو خدا نے کیا حُسن بخشا ہے ۔ مرزا صاحب نے دیکھا اور بلیساختہ فرمایا ؎

ہے جو صاحب کے کفِ دست پر یہ چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے اسے جسقدر اچھا کہئے

محفل میں واہ واہ ۔ سبحان اللہ ۔ کا شور اُٹھا ۔ قدر دان قربان ہو گئے ۔ کرم حسین نے کہا ۔ کچھ اور تشبیہات فرمایئے ۔ مرزا غالب نے ذرا سوچا ذہن پر زور دیا اور کہا ۔

قطعہ

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے اسے جسقدر اچھا کہئے
خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیئے
ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیئے
مہرِ مکتوب عزیزانِ گرامی لکھیئے
حرزِ بازوئے شگرفانِ خود آرا کہیئے

مسّی آلودہ سہ انگشتِ حسیناں لکھیے
داغِ طرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہیے
خاتمِ دستِ سلیمان کے مشابہ لکھیے
سرِ پستانِ پری زاد سے مانا کہیے
اخترِ سوختۂ قیس سے نسبت دیجیے
خالِ مشکینِ رُخِ دل کشِ لیلا کہیے
حجرالاسودِ دیوارِ حرم کیجیے فرض
نافہ آہوئے بیابانِ ختن کا کہیے
وضع میں اس کو اگر سمجھیے قافِ تریاق
رنگ میں سبزۂ نوخیزِ مسیحا کہیے
صومعے میں اسے ٹھہرائیے گر مہرِ نماز
میکدے میں اسے خشتِ خمِ صہبا کہیے
کیوں اسے قفلِ درِ گنجِ محبت لکھیے
کیوں اسے نقطۂ پرکارِ تمنّا کہیے
کیوں اسے گوہرِ نایاب تصوّر کیجیے
کیوں اُسے مردمکِ دیدۂ عنقا کہیے
کیوں اسے تکمۂ پیراہنِ لیلیٰ کہیے
کیوں اسے نقشِ پئے ناقۂ سلما کہیے
بندہ پرور کے کفِ دست کو دل کیجیے فرض
اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیے

ایک صاحب نے اُٹھ کر تعظیم کے بعد عرض کیا۔ مرزا صاحب میں تو آپ کو جہانِ سخن کا ولی مانتا ہوں۔ مرزا صاحب نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور کہا۔ تو پھر یوں فرمایئے ؎

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

ایک گوشے سے آواز آئی۔ تو پھر اس لعنت پر لعنت بھیجیے مرزا نے کہا۔ آپ بُرا سمجھتے ہیں۔ تو اسے بُرا نہ کہیے۔

اس کا ہر فعل صورتِ اعجاز
اس کا ہر قول معنی الہام
وہ چیز جس کے لئے ہم کو ہے بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفام ؟ کیا ہے !!

ایک صاحب نے کہا۔ مرزا جی! ہم نے تو آپ کو آج تک غزل کا شہنشاہ سمجھ رکھا تھا۔ واللہ آپ تو ہر میدان کے غازی ہیں۔ مرزا صاحب نے اس کی طرف دیکھا اور کہا ؎

بقدرِ شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہئے وسعت میرے بیان کیلئے

کرم حسین نے کہا۔ مرزا صاحب اس وقت آپ کا ایک مقطع کیا

خوب یاد آیا ہے ؎

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

ایک ایرانی شاعر نے تعریف کی اور کہا۔
مرحبا۔
دریں چہ شک۔
حاضرین محفل داد دے رہے تھے اور مرزا صاحب چپ چاپ چپکی ڈلی چبا کر مسکرا رہے تھے۔
پنشن کے مقدمہ کے سلسلہ میں گورنمنٹ نے سر جان میلکم گورنر بمبئی سے جو لارڈ لیک کے سیکریٹری رہ چکے تھے اور انہیں کے روبرو جاگیروں اور پنشنوں کی اسناد لوگوں کو ملی تھیں مرزا غالب کے معاملہ میں اس دعویٰ کی بابت استفسار کیا انہوں نے مرزا کے دعویٰ کو غلط بتایا۔ اور جس قدر پنشن فیروز پور جھرکہ سے ملنی قرار پائی تھی۔ اس کی مفصّل کیفیت جو مرزا کے دعویٰ کے بالکل برعکس تھی۔ حکومت کو بھیجدی۔ اس کے بعد مرزا کو ناکام واپس ہونا پڑا۔ اگرچہ اسٹرلنگ نے مرزا کے حق میں کوشش کی لیکن چونکہ ان کے دعویٰ کے ثبوت میں جن کاغذات کا حوالہ دیا گیا تھا۔ وہ حکومت

کے ریکارڈ میں موجود نہ تھے۔ اس لئے عدم ثبوت کی بنا پر وہ بھی کچھ نہ کر سکے۔ تاہم اس نے مرزا صاحب کو چلتے وقت اُمید دلائی کہ آپ دوبارہ اس کی اپیل دائر کر دیں میں از سرِ نو کوشش کروں گا۔

کلکتہ سے واپس دہلی آتے ہوئے مرزا غالب کانپور میں ٹھہر گئے۔ کانپور میں دو سرائے تھیں ایک ذرا معیاری قسم کی تھی اور دوسری عام انداز کی تھی۔ مرزا غالب اس گھٹیا قسم کی کچی سرائے میں ٹھہر گئے۔ اس خیال سے کہ اوّل تو اس شہر میں غالب کا شناسا کوئی نہیں اور اگر کہیں کوئی ہے تو اُسے پتہ تک نہ مل سکے گا اور کسی کو ہماری آمد کی خبر نہ ہوگی۔ لیکن رات کا ایک حصّہ ختم ہوا تو سرائے کی بی بھٹیارن نے مرزا کو اطلاع دی کہ آپ سے کوئی خاتون ملنے آئی ہیں۔ مرزا صاحب کو اس بات پر اعتبار نہ آیا۔ اور سوچا کہ اس شہر میں کون عورت ہو سکتی ہے جو ہم سے آشنا ہو اور اُسے کانپور میں ہماری آمد کا علم ہو اور اُسے یہ بھی معلوم ہو کہ مرزا غالب سرائے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔

نہیں ہماری کوئی واقف عورت ایسی نہیں ہے۔ چنانچہ بی بھٹیارن سے مرزا صاحب نے کہا۔

بڑی بی آپ نے جو زحمت اٹھائی اس کا شکریہ! اس ملنے والی عورت کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس شہر میں ہمارا کوئی ملاقاتی آباد نہیں ہے۔ بی بھٹیارن واپس چلی گئی اور جا کر اس عورت کے

سامنے مرزا کے وہ الفاظ دہرا دیئے۔ عورت نے بی بھٹیارن سے کہا۔ کہ ایک بار پھر تکلیف کریں۔ اور جا کر کہیں کہ آنے والے کو غلط فہمی نہیں ہوئی۔ میں مرزا اسد اللہ خاں غالب جو پہلے آگرہ میں رہتے تھے اور اب دہلی میں آباد ہیں سے ملنے آئی ہوں۔ بی بھٹیارن نے پھر مرزا سے جا کر کہا۔ مرزا کی سمجھ میں کچھ نہ آرہا تھا کہ ہم سے ملنے والی وہ بھی ایک خاتون وہ بھی کانپور سے وہ بھی رات گئے ملنے آئے یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔

بہرحال مرزا صاحب نے بھی بھٹیارن سے کہا کہ اسے اندر بھیجیۓ وہ عورت پردہ میں لپٹی ہوئی مرزا کے کمرے میں آگئی۔ مرزا نے دیا روشن کیا۔ عورت نے سلام کیا۔ مرزا نے جواب دیا اور پوچھا آپ کون ہیں؟ اور مجھ غریب الدیار سے ملنے کا سبب کیا ہے۔

عورت نے آہستہ سے کہا۔

بہت خوب یہ وقت بھی دیکھنا نصیب تھا کہ مرزا جی پوچھیں کہ تم کون ہو۔؟

مرزا صاحب نے آواز پر کان دھرے اور آواز پہچاننے کی کوشش کی آواز مانوس تھی۔ لیکن منہ کھُل نہیں رہا تھا۔ مرزا نے کہا۔ اگر آپ کو ہم سے پردہ نہیں تو پردہ ہٹایئے۔ ہم بھی تو دیکھیں ہم سے کون ملنے آیا ہے۔ لیکن عورت نے پردہ نہ ہٹایا۔ مرزا کی تشویش میں اور بھی اضافہ ہوا سوچنے لگے۔ خدا خیر کرے کوئی پُراسرار شخصیت معلوم ہوتی

ہے۔ مرزا صاحب نے دوبارہ پوچھا۔ اچھا آپ اپنا نام ہی بتا دیں۔ ہم شکر گزار ہوں گے۔ عورت نے کہا۔ واہ رے ستمگر آواز سن کر بھی آواز نہ پہچانی۔ مرزا صاحب نے ذہن پر زور دیا۔ لیکن کانپور کے پورے شہر میں سے کسی گلی کوچے سے کوئی آواز نہ آئی کوئی سراغ نہ ملا۔ مرزا نے کہا۔ یقیناً آپ کو مغالطہ ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے ہم سے پہلے آپ کا کوئی عزیز یہاں آکر ٹھہرا ہو اور آپ اس دھوکے میں ہم سے ملنے آ گئی ہیں۔ اس پر عورت نے دھیمی آواز میں کہا۔ نہ کوئی مغالطہ ہے نہ دھوکہ۔ میں تو آپ کی بہتری کی خاطر آپ سے ملنے چلی آئی تھی۔ اگر میرا آنا ناگوار گذرا ہے تو معاف فرمادیں۔

مرزا نے حیران ہو کر پوچھا۔ مگر ہم کیسے معاف فرمادیں! ہمیں یہ گتھی سلجھانا دشوار ہو گیا ہے۔ اگر مضائقہ نہ ہو تو کم از کم اپنا نام تو بتائیں تاکہ ہم آپ سے کچھ گفتگو کر سکیں۔ جب تک مہمان کا نام معلوم نہ ہو اس کے ساتھ بات چیت کیوں کی جا سکے! عورت نے کہا۔ کیا کیجئے گا مرزا صاحب نام معلوم کر کے۔ اب نام معلوم کرنے میں رکھا ہی کیا ہے۔ میں خود یہاں غریب الدیار ہوں۔ مرزا نے کہا۔ آپ پہیلیوں میں باتیں کر رہی ہیں۔ قیاس کہتا ہے۔ آپ مرزا سے واقف ہیں اگرچہ ٹھیک ہے تو یہ غماز کیا معنی۔ اپنی آمد کا سبب ہی بتائیں ورنہ۔

ورنہ کیا؟ آپ یہی کہیں گے نا۔ ورنہ تشریف لے جائیے۔ عورت نے بڑے طنز اور ادا سے کہا۔

مرزا نے کہا۔ ہم تو کچھ بھی نہیں کہہ سکتے۔ آپ تو خواہ مخواہ معمہ بن رہی ہیں۔ عورت نے کہا۔ آپ سب کچھ کہہ سکتے ہیں۔
میں اب بھی سب کچھ سُننے کو تیار ہوں "۔

مرزا نے کہا۔ کچھ کہنے تو آپ آئی ہیں۔ سُننا ہمیں ہے۔ عورت نے کہا۔ تو سُنئیے۔ کانپور میں ٹھہرنے کا آپ کا کوئی مقصد نہیں ہے خدا جانے آپ دہلی جاتے ہوئے بیکار یہاں کیوں اُتر گئے ؟
آپ کی بہتری اسی میں ہے کہ صبح ہونے سے پہلے پہلی گاڑی میں یہاں سے نکل جائیں "۔

مرزا: وکیوں ۔؟

عورت: آپ کی جان خطرے میں ہے۔

مرزا: جان خطرے میں ہے؟ ہمارا جان لیوا یہاں کون ہے؟

عورت: وہ جس کو آپ کے ساتھ عداوت ہے۔ وہ جو آپ کا رقیب ہے۔

مرزا: کانپور میں ٹھہرنے کا ہمارا مقصد کچھ نہیں ہے۔ ہم اپنے آپ پر حیران ہیں کہ یہاں کیوں اُتر گئے۔ کس کی خاطر یہاں اُتر گئے! خیر آج نہیں تو کل چلے تو جائیں گے۔ لیکن اب تو دیکھکر ہی جائینگے۔ دیکھیں گے مسافری میں ہمارا دشمن کون ہے اور اُسے کس بات پر عداوت ہے۔ پنشن کے سلسلے میں ہم کلکتہ گئے تھے۔ اگر اس جھگڑے میں ہمارا کوئی دشمن ہے تو بہتر ہے۔ آمنا سامنا ہو جائیگا۔

عورت: آپ کی یہ پرانی عادت ہے کہ بات میں بات پیدا کرتے ہیں۔ لیکن یہ وقت دل لگی کا نہیں ہے۔ مسافرت میں سب کچھ ہو جاتا ہے۔ خطرے میں پڑنا دانائی نہیں ہے۔"

مرزا: ہم حیران ہیں کہ کانپور میں ہمارا دشمن کون ہے اور پھر اسے ہمارے یہاں ٹھہرنے کی خبر کیونکر ہوئی۔ اور اگر ہو بھی گئی تو آپ اس کی رازدار ہیں۔ ہماری ہمدرد کیونکر ہو گئیں؟

ہو سکتا ہے کلکتہ کے مخالفین نے ہمارا پیچھا کیا ہو لیکن آپ مرزا غالب کی مہربان کون ہیں؟ جب تک ہمیں یہ معلوم نہ ہوگا ہم یہاں سے اُٹھنے والے نہیں ہیں۔"

عورت: میں آپ کی عادت سے واقف ہوں آپ ضد پہ آجائیں تو کبھی نہیں ٹلتے۔

مرزا: آپ ہمیں کہاں سے جانتی ہیں؟ آپ ہماری عادت سے کیونکر واقف ہیں۔؟

عورت: میرا پوچھ کر کیا لیں گے۔ میں تو اتنا کہنے آئی تھی کہ آپ یہاں سے چلے جائیں آپ کی جان اور عزت دونوں خطرے میں ہیں۔

مرزا: اب ہمیں زندگی عزیز نہیں ہے۔ ہم اس زندگی سے بیزار ہیں۔ کیوں نہ اس کا تماشہ دیکھیں۔ جس نے ہمارا تماشہ دیکھا ہے۔

عورت: اپنے بیوی بچوں پر ترس کھائیں اور یہاں سے چلے جائیں۔

مرزا: چلے جائیں گے ہم یہاں رہنے نہیں آئے۔ لیکن ہم آپ کی

بات سے مرعوب ہو کر نہیں جائیں گے۔ کسی انجان کی بات کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے آپ خود ہی کوئی دھوکہ ہوں۔

عورت: مجھ سے خطرہ ہے تو میں چلی جاتی ہوں۔ یہ کہکر وہ عورت اُٹھی۔
مرزا نے اس کا دامن کھینچا۔ اس کا برقعہ سر سے سرک گیا۔ وہ بے نقاب ہو گئی۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔
مرزا نے تعجب سے کہا۔

مرزا: تم!! رام کلی تم!!۔

عورت: ہاں مرزا جی۔ میں رام کلی۔ بد نصیب رام کلی۔

مرزا: تم کانپور میں کیسے؟

عورت: اماں کے مرنے کے بعد میں یہاں اپنی خالہ کے پاس چلی آئی تھی۔ وہ بھی زندہ نہ رہی۔

مرزا: تمہیں ہمارے یہاں آنے کی خبر کیونکر ہوئی۔ جب ہمیں تمہارے متعلق یہ تک معلوم نہیں کہ تم کہاں ہو۔ کس حال میں ہو۔!

عورت: مجھے معلوم ہے آپ کو مجھ سے نفرت ہے۔ میں اسی لائق تھی مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں۔ لیکن میرے دل میں وہی اُلفت۔ وہی قدر۔ اور وہی عزت ہے۔" اگر آپ رحم فرا سکیں تو میری ماں کی غلطیوں کو معاف فرما دیں۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔

مرزا: لیکن تم نے یہاں آنے کا باعث ظاہر نہیں کیا۔

رام کلی: آپ کو یاد ہو گا آگرہ میں ایک کوتوال تھا۔

مرزا: ہاں ہاں خوب یاد ہے۔ وہ ہماری الہی جان کا بھی ملنے والا تھا۔"
رام کلی: جی وہی کوتوال ۔ وہ تبدیل ہو کر کانپور آیا ہوا ہے۔
اب وہ ہمارے علاقہ مول گنج کا کوتوال ہے۔
مرزا: پھر تو اس کا تمہارے ساتھ خوب میل ملاپ ہو گا۔
رام کلی: اب پرانی داستان کا کیا ذکر۔ نہ وہ دن رہے۔ نہ وہ راتیں۔
وہ کوتوال اب بھی میرے ہاں آتا جاتا ہے۔ اُسے معلوم ہے کہ میں آپ کی ستائی ہوئی ہوں۔ اُسے گمان ہے کہ میں آپ کی دشمن ہوں۔ اسی خیال سے اُس نے کل مجھ سے آپ کا ذکر کیا۔ کہ آپ کلکتہ سے دہلی جاتے ہوئے یہاں پکی سرائے میں ٹھہرے ہیں۔ اس کے ارادے اچھے نہیں ہیں۔ اس نے آپ سے بدلہ لینے کی قسم کھا رکھی ہے۔ وہ کانپور کا کوتوال ہے اور آپ ایک مسافر وہ با اختیار ہے۔ وہ ہر ایک قانون آپ کے خلاف آسانی سے استعمال کر سکتا ہے۔ وہ آپ کو بے عزت کر کے ملزم قرار دے سکتا ہے۔ جیسا کہ اس نے مجھ سے کہا ہے۔ اس نے آپ کو راستے میں دیکھ لیا تھا۔ اور پولیس کے آدمی آپ کے پیچھے لگا دیئے تھے انہی پولیس کے آدمیوں نے اُسے خبر دی ہے کہ آپ پکی سرائے میں ٹھہرے ہیں۔ وہ کل کسی نہ کسی طرح آپ کو گرفتار کر کے سخت تکلیف پہنچانے والا ہے۔
مرزا: کیا آپ اس راز میں شریک ہیں۔

رام کلی: جی نہیں: اس نے مجھ سے آپ کی باتیں کیں میں خاموشی سے سُنتی رہی اُسے یقین ہو گیا ہے میں بھی آپ کے خلاف ہوں۔ پھر اُس نے مجھے بتایا کہ آپ مچھلی بازار میں پکی سرائے میں ٹھہرے ہیں۔ اُس نے یہاں تک کہا کہ الہی جان کی موت کا سبب مرزا غالب ہے اب میں اس مرزا کو اس کے پاس پہنچا کر رہوں گا تاکہ اس کی روح مرزا سے انتقام لے سکے۔

مرزا: بہت خوب، گویا یہاں کے خدائی اختیارات اُس کے سپرد ہیں!

رام کلی: آپ پھر دل لگی فرما رہے ہیں۔ آپ یہاں سے نہ گئے تو میں اپنی جان پر قربان کر دوں گی۔

مرزا: اچھا رام کلی تم اپنے شہر میں ہمارا قیام گوارا نہیں کرتیں تو ہم چلے جاتے ہیں۔

رام کلی: (ہاتھ جوڑ کر) خدا کے لئے ایسا نہ کہیں۔ میرے اختیار میں ہو تو تمام عمر آپ کو اپنے پاس رکھوں۔ لیکن وہ کوتوال بڑا ظالم آدمی ہے۔ وہ آپ کے دشمنوں کو ذلیل کرنے پر اترا ہوا ہے۔"

مرزا: ہم تمہارے بیحد ممنون ہیں۔ تم نے ہماری خاطر واقعی بہت تکلیف اُٹھائی ہے۔ مرزا تمہاری اس ہمدردی کے لائق نہ تھا۔

رام کلی: (رام کلی کی آنکھیں نمناک ہو گئیں) مجھے شرمندہ نہ کریں۔ مجھے افسوس ہے کہ کسی وجہ سے آپ کانپور ٹھہرے اور میں آپ کی کوئی خدمت نہ کر سکی۔ مجھ پر آپ کے ہزاروں احسان ہیں۔"

اچھا مرزا جی ۔ بہت دیر ہو گئی۔ اگر کوتوال میرے مکان پر آگیا اور مجھے مکان پر نہ پایا۔ تو اُسے ضرور وہم گذرے گا۔ ہو سکتا ہے۔ وہ یہاں آ جائے۔ اب مجھے جانے دیجئے اگرچہ جی نہیں چاہتا وہ وہاں سے اُٹھی اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ اس نے عجیب انداز میں مرزا کو سلام کیا اور چلی گئی ۔ مرزا اپنے ماضی میں گم ہو کر رہ گئے ''

قرض کی پلٹتے تھے مئے

مرزا غالب کے کلکتہ کا سفر بیگم کے زیورات کے رہن اور قرض سے انجام پایا تھا۔ انہیں امید تھی کہ مقدمہ کی کامیابی کے بعد جائداد واگذاشت ہو جائے گی اور تمام تنگی کے دن ختم ہو کر فراغت کا وقت نصیب ہوگا۔ لیکن مقدمہ کی ناکامی سے ان تمام امیدوں پر خاک پڑ گئی۔ لیکن امراؤ بیگم نے مرزا کی ہمت بڑھائی اور اپیل دائر کرنے کا مشورہ دیا۔ ادھر قرض خواہوں نے تقاضے شروع کر دیئے۔ اور مرزا کے خلاف نالش پر نالش ہونے لگی۔ بیگم نے زور دیا کہ جب بڑے صاحب نے آپ سے وعدہ کر لیا ہے۔ تو آپ کو ایک بار پھر کلکتہ جا کر اپیل دائر کرنی چاہیئے۔ کیونکہ اگر جائداد اور پنشن واپس نہ ملے تو زندگی گذارنا سخت مشکل ہو جائے گا۔ مرزا نے کہا یہ باتیں ہمیں بھی آتی ہیں لیکن سوال مصارف کا ہے۔ تنگدستی اس قدر بڑھ چکی ہے۔ کہ کلکتہ کے سفر کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ فیروز پور جھرکہ کے عزیزوں سے

کھلم کھلا مخالفت ہو چکی ہے۔ آمدنی کے ذرائع مسدود ہو چکے ہیں۔
بیگم کے زیورات سفر کلکتہ کی نذر کر چکے ہیں۔ اب نئے سفر کے اخراجات
کہاں سے آئیں۔!

ایک روز مرزا کو معلوم ہوا کہ ایک قرض خواہ نے ان کے خلاف
عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا ہے۔ لیکن وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان
تفکرات میں بیگم کو بھی شریک کر لیا جائے۔ مگر امراؤ بیگم مرزا کو پریشان
دیکھ کر ایک پل چین سے نہیں بیٹھ سکتی تھیں۔ بیگم نے جب بیحد
اصرار کیا تو مرزا نے بتایا کہ مقصدی لال نے اپنے قرضہ کی نالش دائر کر دی
ہے۔ بیگم نے سُن کر کہا۔ تو دیکھا جائے گا۔ جو ہوگا۔ اس کے لئے اس
قدر پریشان ہونے کی ضرورت کیا ہے۔ اللہ مالک ہے۔

مرزا نے طنز سے کہا۔ اللہ تعالیٰ تو بعد میں مالک ہوگا۔ اسوقت
تو مفتی صدر الدین آزردہ فیصلے کا مالک ہے۔

بیگم نے قدرے مایوس ہو کر کہا۔ معلوم نہیں خدا نے ہمیں
کیوں پریشانیوں میں ڈال رکھا ہے۔

مرزا نے مسکرا کر کہا۔ خدا کو ان باتوں سے کیا تعلق اُسے اپنی
خدائی کے کاروبار سے فرصت کہاں۔

خدا کے متعلق خدا کی سرد مہری دیکھ کر یہی کہنا پڑتا ہے۔

زندگی اپنی جو اس رنگ سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے۔ کہ خدا رکھتے تھے

لیکن ضمیر کی زبان پر یہ شعر تھا۔

قرض کی پیتے تھے مے اور جانتے تھے ہم کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

★

بیگم نے کانوں تک ہاتھ لیجا کر کہا۔ توبہ کیجیے۔ آپ کی یہی باتیں تو اچھی نہیں۔ اللہ میاں کی شان میں آپ اس قسم کی بیباک بے ادبی کرتے ہیں اسی سبب سے ہم پر عذاب نازل ہے۔ جب خدا کے سامنے جائیں گے۔ تو کیا منہ لے کے جائیں گے؟ اس وقت انسان کی گستاخیوں کی جواب دہی ہو گی۔ آپ ہیں کہ نہ روزہ نہ نماز۔

مرزا نے اسی وقت دو شعر کہہ دیئے ؎

افطار صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو
اس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے تو بیچارہ کیا کرے

مرزا اس دل لگی سے خوش ہوئے لیکن بیگم کو یہ ظرافت پسند نہ آئی۔ کیونکہ وہ صوم وصلوٰۃ کی پابند تھی۔ اس نے منہ بنا لیا۔ اور ناراضگی کی نگاہ سے مرزا کو دیکھا۔ مرزا ہنس پڑے۔ اور کہا ؎

سامان خورد خواب کہاں سے لاؤں
آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
روزہ میرا ایمان ہے غالبؔ لیکن
خس خانہ و برف آب کہاں سے لاؤں

بیگم نے کہا۔ خدا سے توبہ کر کے نماز شروع کر دیں۔ اللہ معاف فرمانے والا ہے۔

مرزا نے کہا۔ بیگم نماز رشوت نہیں ہے۔ اور نہ ہی خدا راشی ہے۔ نماز تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کا ایک جزو ہے۔ عبادت کا کوئی صلہ نہیں ہوتا۔ عبادت سے خود انسان کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے بیں تو گنہگار سہی مجھے سزا مل رہی ہے ٹھیک ہے۔ تم نے تو عمر بھر نمازیں پڑھی ہیں۔ باقاعدگی سے روزے رکھتے ہیں نہایت نیک زندگی گذاری ہے۔ حتیٰ کہ ہمارے برتن بھی الگ کر رکھے ہیں۔ تم نے پھر تم ہی کہو تمہیں کیا ملا ہے؟ پھر تم کس گناہ کی پاداش میں مصیبتوں میں مبتلا ہو۔؟

بات یہ ہے بیگم کہ ہم سیاہ بخت ہیں۔

ے

سیاہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے
جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے
ہوا نہ غلبہ میسّر کبھی کسی پر مجھے
کہ جو شریک ہو میرا شریکِ غالب ہے

★

بیگم نے کہا۔ ہاں ہاں میں شریکِ غالب ہوں اور مجھے اس پر فخر ہے کہ۔ میں شریکِ غالب ہوں۔ نہ میرے میکے میں نہ میرے سسرال میں غالب سا کوئی ہے نہ ہوگا۔ غالب یکتائے روزگار ہے۔

مرزا صاحب بیگم کی زبان سے اپنی مدح و ستائش چپ چاپ سنتے جا رہے تھے۔ اور پھر بولے۔ بیگم ہمیں خدا کی بارگاہ کا خوف نہیں ہے۔ اس لئے کہ عفو تقصیر پر قادر ہے۔ خطرہ تو یہاں کی عدالت کا ہے۔ جہاں عزت پر حرف آرہا ہے۔ ہمیں دکھ اس بات کا ہے کہ ہماری وجہ سے تم عذاب میں مبتلا ہو۔ جائداد رہنا فروخت ہو چکی ہے۔ اثاثہ بیچ کر کھا گیا۔ تمہارے زیور کا تار تار فروخت کر ڈالا اپنا سب کچھ برباد کر کے تمہارے میکے آن پڑا۔ کیسا ظالم ہے غالب کہ تمہارے بھائیوں کی مہربانیوں کو بھی نیلام کر ڈالا۔ اور ایک شہزادی کو کرائے کے مکان میں لا کر ڈال دیا۔ مرزا نے ٹھنڈا سانس بھرتے

ہوئے کہا۔

اُف ہمیں تو عمر بھر اطمینان میسر آتا نظر نہیں آتا۔

پہلے تو قرض خواہوں کو اُمید تھی کہ مرزا مقدمہ جیت جائیں گے۔ دولت واپس مل جائے گی۔ لیکن مقدمے میں ناکامی نے ان لوگوں کو بھی عدالت میں جانے کے لئے مجبور کر دیا۔

۱۸۳۰ء کا زمانہ تھا کہ اسٹرلنگ کا انتقال ہو گیا۔ مرزا کی رہی سہی امید بھی ٹوٹ گئی۔ اب وہ ہر طرف سے نامرادیوں کا سامنا کرنے پر مجبور نظر آئے۔ مرزا پاؤں توڑ کر بیٹھ گئے۔ بیگم نے پھر عرض کیا اور کچھ نہیں تو میرے ساتھ خدا کی عبادت میں ہی شریک ہو جایا کریں۔ اس سے ثواب بھی ملتا ہے۔ اور سکون قلب بھی۔ مرزا نے کہا۔ ہاں بیگم ہم جانتے ہیں ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

☆

مرزا اپنی شوخ طبعی سے کسی حال بھی باز نہ آئے۔ اسی عرصہ میں مرزا نے دہلی کے ریذیڈنٹ ولیم فریزر کے ذریعہ گورنر جنرل کے پاس اپیل دائر کر دی۔ لیکن افسوس کہ وہ بھی مسترد ہو گئی۔ اب کوئی چارہ نہ رہا۔ اب ہاتھ پاؤں مارنے کی گنجائش ہی نہ رہی۔ کچھ عرصہ

بعد گورنر جنرل کلکتہ سے دہلی آئے۔ تو دوستوں نے مشورہ دیا کہ ان سے ملاقات کی جائے۔ لیکن مرزا نے کہا۔ مرے طالع مربی کش کو کسی بارگاہ سے انصاف کی توقع نہیں ہے ؎

جب توقع ہی اُٹھ گئی غالب
کیا کسی کا گِلہ کرے کوئی

☆

آخر مرزا کو مفتی صدرالدین کی عدالت میں حاضر ہونا پڑا۔ اس سے بڑا رنج مرزا کے لئے کوئی اور نہ تھا۔ اتنی بڑی ذلت کا سامنا کبھی نہ ہوا تھا۔ مرزا عدالت کے کٹھرے میں کھڑے تھے اور شامتِ اعمال کا جائزہ لے رہے تھے۔ متصدی لال بنیا سامنے تھا۔ دعویٰ ثابت ہو چکا تھا۔ کسی ثبوت یا شہادت کی ضرورت نہ تھی۔ مرزا قرض کا اقرار کر چکے تھے۔ عدالت نے مرزا کے خلاف قرض خواہوں کے حق میں ڈگری دے دی۔ اور مبلغ ایک سو روپیہ کی ادائیگی کا فوری حکم سنا دیا۔ مرزا پریشان کھڑے تھے۔ مفتی صاحب سے آنکھ ملا کر بات بھی نہ کر سکتے تھے۔ انصاف کا فیصلہ تھا۔ مفتی صاحب فیصلہ سنانے پر مجبور تھے۔ وہ عدالت میں بیٹھ کر انصاف کے خلاف جا کر اپنے پیارے دوست مرزا غالب کی حمایت و رعایت نہیں کر سکتے تھے۔ مرزا صاحب عدالت سے باہر آئے تو مفتی صاحب کے اردلی نے آکر سلام کیا

اور کہا۔ حضور گھر تشریف لے جائیں اور کسی قسم کا فکر نہ فرمائیں۔ قرضہ کی رقم مفتی صاحب نے ادا کردی ہے۔ لہذا ڈگری خارج ہوگئی ہے رسید آپ کو مکان پر پہنچ جائے گی۔ اس خبر سے مرزا کی آنکھیں نم آلود ہوگئیں۔ اور اپنے دوست کے احسان کا بوجھ لئے گھر چلے گئے۔

اُس سیم تن کے پاؤں

نواب شمس الدین خان والیٔ فیروز پور جھرکہ اور ایجنٹ دہلی مسٹر ولیم فریزر میں ایک زمانہ سے گہری دوستی چلی آ رہی تھی۔ ایک روز نواب صاحب کی چھوٹی ہمشیرہ حمیدہ خانم بیگم باغ میں پھولوں کا میلہ دیکھنے جا رہی تھیں۔ دروازے پر گھوڑا گاڑی کھڑی تھی۔ نواب صاحب کے ہاں پردہ کا شدّت سے انتظام و اہتمام تھا۔ حویلی سے حمیدہ خانم کنیزوں کے ساتھ باہر آئی وہ پردہ میں لپٹی ہوئی تھی۔ عین اس وقت مسٹر فریزر بھی گھوڑے پر سوار ادھر آ نکلے۔ مستورات کو دیکھکر وہ ایک طرف ہو گئے۔

ایک کنیز نے شہزادی سے کہا کہ صاحب مہمان آئے ہیں یہ سنکر حمیدہ خانم عجلت میں ہو گئیں۔ اور جلدی سے گاڑی میں سوار ہونے لگیں۔ اسی عجلت میں ایک پاؤں سے جوتا نکل گیا۔ اور پاؤں ننگا ہو گیا۔ مسٹر ولیم کی پاؤں پر نگاہ پڑ گئی۔ خوبصورت گورے سڈول پاؤں کو دیکھکر ولیم کا دل بے قابو ہو گیا۔ اور ان دیکھی، شہزادی کی محبت

میں گرفتار ہو گیا۔ جب شہزادی چلی گئیں تو فریزر نے کہا ایک کنیز کو اشارے سے بلایا وہ آگے بڑھی۔ پہلے ولیم نے پوچھا کہ نواب صاحب گھر پر ہیں جواب ملا جی تشریف فرما ہیں۔ پھر اس نے پوچھا۔ یہ کون مہمان آئی تھیں جو گئی ہیں۔ کنیز نے کہا۔"

یہ مہمان نہیں تھیں حضور نواب صاحب کی چھوٹی ہمشیرہ تھیں بیگم باغ میں پھولوں کا میلہ دیکھنے گئی ہیں۔ کنیز اس سے زیادہ وہاں نہ ٹھہر سکی وہ حویلی میں چلی گئی۔ ایک لمحہ کے لئے ولیم خیالوں کی حسین دنیا میں گم ہو گیا۔ اب اُس کی آنکھوں کے سامنے اُس بتِ سیم تن کا گورا سڈول پاؤں تھا۔ ولیم حویلی میں چلا گیا اور نواب صاحب سے ملا۔ حسبِ معمول وہ بڑے تپاک سے پیش آئے۔ شکار کا پروگرام بنایا تھا۔ ولیم نے نواب سے کہا۔" ویل نواب صاحب ہم تمہارا ملک میں آکر تمہارا اُردو زبان سیکھ گیا ہے۔" نواب صاحب نے ہنس کر کہا۔ بڑی خوشی کی بات ہے مبارک ہو۔ ولیم نے کہا۔" تمہارے شاعر لوگ شاعری کرتا ہے۔ ہم بھی شاعری سیکھ گیا ہے۔ ہمارا شاعری سنو۔ شکار کرنے کو آئے شکار ہو کے چلے۔"

نواب صاحب نے خوب خوب داد دی۔ دونوں دوست خوشگوار ماحول میں باتیں کرتے رہے۔

نواب شمس الدین خاں کے دو اور بھائی تھے۔ امین الدین خان اور ضیاء الدین خان۔ یہ بھی جائداد میں برابر کے شریک تھے۔ یہ

دونوں والئی لوہارو تھے۔ ولیم کی ان سے بھی سلام دعا تھی۔ لیکن دوستی نہیں تھی۔ ولیم صبح وشام شہزادی کی محبت کو آتش فراق میں جلنے لگا۔ ولیم نے ایک معتبر آدمی کے ہاتھ نواب شمس الدین خان کو شادی کا پیغام بھیجا۔ جسے نواب صاحب نے نفرت سے ٹھکرادیا۔ بلکہ کہلا بھیجا کہ ہمارے ہاں آنا جانا بند کردیں۔

جب ولیم کو یہ نفرت آمیز جواب ملا تو وہ زہر پی کر رہ گیا۔ وہ فرنگی سیاست دان تھا۔ جذبہ انتقام میں بھڑک نہیں گیا بلکہ سرد مہری اختیار کی۔ نواب صاحب کو اپنے ہاں بلایا اور کہا "بھائی شمس الدین آپ کیسا نواب صاحب ہے۔ ہم تمہارا دوست ہے۔ تم ہمارا دوست ہے۔ ہم نے اس دوستی کو اور مضبوط کرنے کے لئے شادی کا پیغام بھیجا تھا۔ آپ کو پسند نہیں نہ سہی۔ لیکن آپ نے مزاج برہم کیوں کیا۔ ہم کو کہلا بھیجا کہ ہمارے گھر مت آؤ۔ یہ دوستی کی بات نہیں ہے۔ ہمیں یہ بات اچھی نہیں لگی۔ بخدا اگر آپ ہماری بہن سے شادی کرنا مانگتا تو ہم اپنی سب بہنیں لائن میں کھڑا کر دیتے اور بولتے۔ ویل جس کو پسند کرتے ہو اس کا ہاتھ پکڑلو۔ ہم تو تم پر جان بھی قربان کردیتا۔"
یہ چکنی چپڑی باتیں سنکر نواب صاحب کا غصہ ختم ہوگیا۔ اور پھر دوستانہ تعلقات استوار ہو گئے۔ لیکن اب ولیم نے نواب صاحب کے ہاں حویلی میں آنا جانا موقوف کردیا۔ سب سے پہلے ولیم نے نواب شمس الدین کو ریاست لوہارو کی طرف مائل کیا اور کہا۔ کہ لوہارو بہت

بڑی ریاست ہے۔ ہمارے پاس جو حساب کتاب ہے۔ اس کی رو سے فیروز پور جھرکہ کی نسبت چار گنا آمدنی ہے۔ آپ نواب امین الدین سے اس کا حساب مانگیں۔ کل آمدنی کا تیسرا حصّہ آپ کو ملنا چاہیئے۔ نواب شمس الدین اُس کے تانے بانے میں پھنس گیا۔ اور جاگیر کی حساب فہمی کا دعویٰ دار بن کر کھڑا ہو گیا۔ اُدھر ولیم نے امین الدین اور ضیاء الدین کو خفیہ طور پر بُلایا اور ان سے کہا کہ نواب شمس الدین اگرچہ ہمارا دوست ہے۔ لیکن آپ بھی تو دشمن نہیں ہیں۔ ہم گورنمنٹ کے ایجنٹ مقرر ہو کر آئے ہیں۔ ہمارا کام حساب کتاب کی دیکھ بھال ہے۔ جس پر ظلم ہوتا ہو اُسے انصاف دلوانا ہے۔ فیروز پور جھرکہ مکمّل طور پر نواب شمس الدین خاں کے قبضہ میں ہے۔ حالانکہ آپ دونوں قانونی حیثیت سے اُس جاگیر کے حصّہ دار ہیں۔ تم گورنمنٹ کے پاس درخواست دائر کر دو۔ ہم تمہاری مدد کریں گے۔ اور جاگیر میں حصّہ دار بنا کر رہیں گے۔ امین الدین اور ضیاء الدین دونوں اپنے بھائی شمس الدین کے خلاف ہو گئے۔ انہوں نے جاگیر کی حساب فہمی کا دعویٰ دائر کر دیا۔ اس طرح بھائیوں کے درمیان خانہ جنگی شروع ہو گئی ولیم چاہتا تھا۔ کہ شمس الدین اس معاملہ میں اس کی مدد طلب کریں۔ اور وہ اُسے مرہونِ منت بنا کر اپنی آرزو براری کا خواہاں ہو۔ کسی طرح سے یہ بات شمس الدین تک پہنچ گئی۔ اس کے دل میں ولیم کے خلاف نفرت بیٹھ گئی۔ ولیم نے امین الدین خان کو گورنر جنرل کے پاس

کلکتہ بھیجا کہ جاکر گورنر جنرل سے داد خواہ ہو۔ چنانچہ امین الدین کلکتہ چلا گیا اور ولیم نے امین الدین کے حق میں رپورٹ گذار دی۔ اس رپورٹ پر فیصلہ ہوا کہ شمس الدین خان نے باپ کے غلط فیصلہ سے فائدہ اُٹھا کر اپنے دونوں بھائیوں کی حق تلفی کی ہے۔ ریاست لوہارو میں شمس الدین کا کوئی حق نہیں ہے۔ بلکہ فیروز پور جھر کہ کی آمدنی میں امین الدین اور ضیاء الدین کا حق ضرور ہے۔

نواب امین الدین خان اور ضیاء الدین خان اس فیصلے سے بہت خوش تھے۔ لیکن شمس الدین خان کو بڑا دھکا لگا۔ اس کا ایک منہ چڑھا۔ ملازم کریم خان تھا۔ ایک شام جب شمس الدین بجید اداس بیٹھے تھے۔ تو کریم خان نے کہا۔

حضور کس وہم میں پڑ گئے ہیں۔ ناخوش رہیں آپ کے دشمن اُس کمینے فرنگی نے آپ کو دُکھ پہنچایا ہے۔ تو انتقام بھی لیا جا سکتا ہے۔ نواب نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں لیکر کہا۔ کریم خان! انگریز افسر سے بگاڑ پیدا کرنا آسان بات نہیں ہے۔ انتقام لینا تو بہت دُور کی بات ہے۔

کریم خان نے کہا۔ آپ نواب صاحب ہیں۔ شیر سے نہیں ڈرتے انگریز سے ڈرتے ہیں۔ لیکن میں صرف ہندوستانی ہوں۔ انگریز سے انتقام لینا میرا ایمان ہے۔ نواب نے جھڑک کر کہا۔

بس رہنے دو۔ ہمیں خوش کرنے کی باتیں نہ کرو۔ کہنے اور کرنے میں بڑا فرق ہے۔ ہم نے تم ایسے آدمی بہت دیکھے ہیں۔ کریم خان نے مونچھ اونچی کر کے کہا۔ حضور نے بات کے دھنی نہیں دیکھے۔

غلام حضور کا جان نثار ہے۔ کریم خان ایک روز جاں نثاری کا ثبوت دیکر رہے گا۔ نواب نے گردن اٹھا کر پوچھا۔ کیا تم سچ کہہ رہے ہو کریم خان -!!

کریم خان نے کہا۔ اس کمینے نے حضور کو زخم دیا ہے جگر اور دل دونوں چھلنی کر دیئے ہیں۔ کریم خان حضور کے پہلے زخم سے بھی واقف ہے۔ لیکن حضور نے کبھی اپنے وفادار کو ہمراز بنانے کی کوشش نہیں کی۔ کریم خان اس گھر کی عزت کا محافظ ہے۔ اب سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیجیے حضور۔ حضور اپنے غلام کے بال بچوں کی پرورش کی ذمہ داری اٹھا لیں۔ غلام اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتا۔

نواب نے کہا۔ ہم اس کا وعدہ کرتے ہیں۔ اس قول و قرار کے بعد بات ختم ہو گئی۔

مرزا غالب اور ولیم کی دوستی بڑھنے لگی۔ مرزا غالب کو شمس الدین اور ولیم کے درمیان بنائے مخاصمت کا اصل حال معلوم نہ تھا۔ لیکن مرزا شمس الدین سے شدید پرخاش رکھتے تھے کیونکہ شمس الدین

کی وجہ سے مرزا جائداد سے محروم ہو چکے تھے۔ گورنر جنرل لارڈ ٹینگ جس نے مرزا کی اپیل مسترد کی تھی واپس انگلستان جانے والا تھا۔ اور اس کی جگہ لارڈ آکلینڈ گورنر جنرل مقرر ہو کر ہندوستان آنے والا تھا۔ آکلینڈ مسٹر ولیم کا دوست تھا۔ چنانچہ ولیم نے مرزا کو امید دلائی کہ آکلینڈ کے آنے پر دوبارہ اپیل دائر کر سکے میں آپ کے حق میں فیصلہ کرا دوں گا۔ مرزا کے دل کی دنیا میں امید کا چراغ روشن ہوا۔ ولیم دہلی کے امراء روساء میں بیحد مقبول تھا۔ وہ ہندوستانی امیر لوگوں سے مشرقی انداز میں ملتا اور ان سے گھل مل کر رہنے کی کوشش کرتا۔ عام طور پر اُس کا لباس مغلیہ انداز کا رہتا تھا۔

اس کا رہن سہن بھی ہندوستانی طور طریق کا تھا۔

چند دن بعد دہلی کے ایک رئیس زادے نے ولیم کی دعوت کی اس میں دوسرے امراء کے علاوہ مرزا غالب اور مرزا کے دوست فتح اللہ خان بھی شامل تھے۔ دعوت کے بعد مجرا ہوا۔ اس طوائف نے مرزا کی غزلیں سنائیں یہ محفل نصف شب تک گرم رہی۔ ولیم یہاں سے رخصت ہو کر اپنی گھوڑا گاڑی میں بیٹھ کر اپنی کوٹھی کی طرف جا رہا تھا۔ کہ راستے میں کسی نا معلوم شخص نے ولیم پر گولیاں چلا دیں۔ وہ تڑپ کر گولی اور گرتے ہی مر گیا۔ صبح ہوتے ہی ولیم کی موت کی خبر سارے شہر میں پھیل گئی۔ مرزا اور فتح اللہ سنتے ہی اس کی کوٹھی پہنچے۔ فتح اللہ نے اس کی لاش پر رونا شروع کر دیا اور چلا کر کہا۔ ہائے دوست شمس الدین نے تجھے نہ

چھوڑا۔ اس وقت چند انگریز حکام وہاں موجود تھے۔ ان میں ولیم کا حقیقی بھائی سمین فریزر بھی موجود تھا۔ چارلس مٹکاف بھی موجود تھے۔ اتفاق سے جان لارنس پانی پت کے مجسٹریٹ بھی دہلی میں موجود تھے۔ وہ بھی خبر سنتے ہی کوٹھی پہونچ چکے تھے۔ یہ ولیم کے گہرے دوست تھے۔ ولیم دہلی کے مجسٹریٹ تھے۔ سمین کو معلوم تھا کہ فتح اللہ ذاتی طور پر شمس الدین کا دشمن ہے۔ اس خیال سے فتح اللہ کی بات پر چنداں توجہ نہ دی۔ لیکن جان لارنس جو بڑا چالاک اور ہوشیار آدمی تھا۔ بات کا اثر لئے بغیر نہ رہا۔ اور بات دل کے دامن سے باندھ لی۔ دوسرے ہی روز صبح ہونے ہی ایک فوجی دستہ شمس الدین کی حویلی پر پہونچ گیا اور تلاش شروع کر دی۔

اس وقت دہلی کے لال قلعہ میں دورِ مغلیہ کا ایک ٹمٹماتا چراغ اکبر شاہ ثانی آخری سنبھالا لے رہا تھا۔ وہ نام کا بادشاہ تھا۔ حکومت کے کاروبار سے بے خبر۔ حالات سے بے بس۔ اپنی ذات سے بے کس۔ انگریز کے رحم و کرم پر سانس لے رہا تھا۔ سارے شہر میں انگریزی عملداری تھی۔ ہر طرف سخت پہرہ تھا۔ آمد و رفت پر بندش تھی۔ چلنے پھرنے پر پابندی شہر کے ہر دروازے پر آنے جانے والے سے بازپرس ہو رہی تھی۔ سارا شہر سہما ہوا تھا۔ انگریزی حکومت کا اعلےٰ ترین حاکم۔ انگریزوں کی عملداری میں ہندوستانی غلاموں کے ہاتھوں۔ اس بے دردی سے قتل ہو جائے۔ اس کے مجرم کی تلاش میں کیا کچھ نہ ہو رہا

ہوگا۔ مرزا غالب کو اپنے انگریز دوست کے قتل ہو جانے کا بیحد صدمہ تھا۔ اس تعلق سے شمس الدین کے آدمی خیال کر رہے تھے کہ ہو نہ ہو مرزا ہی نے شمس الدین کی مخبری کی ہے۔ شہر دہلی کے سمجھدار لوگ بھی یہ قیاس کرنے پر مجبور تھے۔ ان کی قیاس آرائی کسی حد تک درست بھی تھی۔ لیکن حقیقت بالکل برعکس تھی۔ مرزا کو کسی بات کا قطعی علم نہ تھا۔ بلکہ فتح اللہ کے الزام پر بڑے گہرے انداز سے سوچ رہے تھے۔

شمس الدین کے گھر کی تلاشی جاری تھی۔ ایک روز فرنگی فوجی سپاہی تلاشی لے رہے تھے۔ جان لارنس اور سمین بھی موجود تھے۔ جان لارنس کو پیاس لگی۔ اس نے اپنے سپاہی سے پانی کے لئے کہا۔ سپاہی نواب کے ایک نوکر کے ساتھ گیا۔ اور حویلی کے صحن میں جو کنواں تھا۔ اس میں سے تازہ پانی کا ڈول بھر کے لے آیا۔ ڈول میں کاغذ کے گلے ہوئے پرزے پائے گئے۔ جان لارنس نے وہ پرزے اپنے قبضہ میں لے لئے پھر ان پرزوں کا کیمیائی معائنہ کرایا۔ اور پرزے جوڑ کر ان کے حروف پڑھے گئے۔ تو فارسی زبان کی عبارت صاف پڑھنے میں آگئی۔ لکھا تھا۔

"تم خوب جانتے ہو کہ میں نے تمہیں
دہلی کس غرض سے بھیجا ہے۔ میں تم
کو بار بار تاکید کرتا ہوں کہ کتوں کی
خریداری کس قدر ضروری ہے۔ اگر اب
تک یہ کام نہیں ہو سکا۔ تو جس قدر

جلد ممکن ہو سرانجام دو۔"

پولیس کے کریمنیل سٹاف نے اس عبارت سے یہ مفہوم لیا کہ شمس الدین خاں نے اپنے خاص مقرر کردہ آدمی کے نام چٹھی لکھی ہے کہ دولت کے ذریعہ لالچ دیکر کچھ مناسب آدمی خرید لو۔ اور ان کی مدد سے ولیم کا خاتمہ جلد از جلد کر دو۔ ایک روز جان لارنس اور سیمین نواب کی حویلی میں آئے دیکھا کہ ایک طرف ایک گھوڑا بندھا ہوا ہے گھوڑا خاص نسل کا تھا۔ لارنس نے نواب کے ایک ملازم سے کہا کہ یہ گھوڑا کس کا ہے۔ اس نے کہا ہم ملازموں میں سے کسی کا ہے۔ لارنس کو شک گذرا کہ گھریلو ملازموں کے پاس یہ خاص گھوڑا بے مقصد نہیں ہو سکتا۔ لارنس نے اٹھ کر گھوڑے کا معائنہ کیا دیکھا کہ اس کے نعل اُلٹے لگائے ہوئے ہیں۔ یہ دیکھکر اس کا شبہ یقین میں تبدیل ہو گیا۔ کیونکہ سموں پر اُلٹے نعل یہ کسی مشتبہ شخص کے گھوڑے کی خاص علامت ہے۔ ولایت میں چالاک ڈاکو اور مجرم اپنے گھوڑے کی نعل اس طرح اُلٹی رکھتے ہیں۔ تاکہ پولیس کو سراغ نہ مل سکے۔ اب لارنس نے تحقیق کرائی۔ تو معلوم ہوا کہ قتل کی رات ایسے ہی نعل والے گھوڑے سے کام لیا گیا ہے۔ اب لارنس اور سیمین کو اپنی تفتیش میں خاصی مدد ملنے کی امید بندھ گئی۔ انہوں نے اس گھوڑے کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ اب شمس الدین خان کو ریاست جھرکہ سے دہلی طلب کر لیا گیا۔ نواب کے بہی خواہوں نے نواب کو سمجھایا کہ

آپ دہلی نہ جائیں۔ سکھوں کی عملداری میں بھاگ جائیں۔ وہاں کسی انگریز کا ہاتھ نہیں پہونچ سکے گا۔ لیکن نواب نہ مانے اور وہ دہلی آ گئے۔ جب نواب صاحب کی سواری شہر کے دروازے پر پہنچی تو پہرہ دار نے روک لیا۔ اور تمام ہتھیار اپنے قبضہ میں کر لئے اس کے بعد نواب کو گرفتار کر لیا گیا۔ نواب حیران پریشان تھے کہ یہ کیا ہو گیا۔ لیکن اب کوئی تدبیر کارگر نہ ہو سکتی۔ چنانچہ نواب کو جوڈیشل حوالات بھیج دیا گیا۔

چند ہی دنوں میں انگریز پولیس نے کریم خاں اور اس کے ساتھی آینا کو بھی گرفتار کر لیا۔ آینا سلطانی گواہ بن گیا۔ اور اس نے عدالت میں شہادت دے دی کہ نواب کے کہنے پر کریم خان نے ولیم کو قتل کیا ہے۔ اس نے یہ بھی اقرار کیا کہ میں بھی کریم خان کے ساتھ تھا۔ کیونکہ مجھے بھی نواب صاحب کا یہی حکم تھا۔ پھر آینا نے بیان دیا کہ ولیم فریزر۔ مقتول نواب صاحب کی ہمشیرہ سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ ان کی یہ درخواست نواب صاحب نے حقارت سے ٹھکرا دی تھی۔ رنجش کی اصل وجہ یہ تھی۔ ورنہ اس سے پہلے ولیم اور شمس الدین بڑے گہرے دوست تھے۔ اس گواہی پر حکومت کے قانون نے کریم خان اور نواب شمس الدین دونوں کو پھانسی کی سزا کا حکم سنا دیا۔ نواب نے اپیل کی لیکن آینا اور فتح اللہ کے بیانات اور کنویں میں سے کاغذ کی تحریر کے ثبوت میں نواب کی اپیل مسترد کر دی گئی۔

اور ماہ اکتوبر ۱۸۳۰ء میں نواب شمس الدین خاں کو کشمیری دروازے کے باہر پھانسی دے دی گئی۔ پھانسی کے وقت سوگواروں کا مسلح پہرہ لگایا گیا تھا۔ کیونکہ حکومت کو نواب صاحب کی حمایت میں بغاوت کا خطرہ تھا۔ تمام شہری اور فوجی حکام یہاں موجود تھے۔ نواب صاحب کو پھانسی کے تختہ کی طرف لے جایا گیا۔ انہوں نے ہنس کر کہا۔ میں کوئی بکرا نہیں ہوں کہ ذبح خانہ کی طرف لے جا رہے ہو۔ میں اس خاندان کا فرد ہوں جو کبھی موت سے نہیں ڈرا۔ میں خود تختہ پر جاؤں گا۔ اور پھر تختہ دار پر کھڑے ہو کر کہا۔ ولیم ایک ذلیل انسان۔ ایک بداخلاق افسر اور ایک کمینہ دوست تھا۔ اس نے دوست بن کر ہمارے خاندان کی عزت پر نگاہ ڈالی۔ ہماری غیرت نے اس کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند کر دیں۔ غیرت اور غیرت سے وفاداری کے جرم کی سزا میں ہم اپنی موت کو خوشی اور دلیری سے گلے لگاتے ہیں اور مسلمان کی تاریخ میں اپنے خون سے لکھ جاتے ہیں کہ غیرت پر جان قربان کر دینا اصل حق ادا کرنا ہے۔ کریم خان نے حق نمک ادا کر دیا۔ زندہ باد کریم خان۔ اور اپنا نے چند روز زندگی کے لئے مستقل عذاب کا سودا کیا ہے۔ تھو ہے اپنا تجھ پر۔ پھر کلمۂ شہادت پڑھا۔ اور پھندا گلے میں ڈال لیا۔

ظلمت کدہ میں میرے شب غم کا جوش ہے

جنوری ۱۸۳۵ء میں مرزا غالب نے ایک بار پھر قسمت آزمائی کی اور حکومت کے دفتر میں ایک بار پھر اپیل کی درخواست گزاری۔ اس درخواست میں والی فیروز پور جھرکہ نواب شمس الدین خان کے شقہ کو جعلی اور فرضی ثابت کر کے اور حاجی خان کو اپنی خاندانی جائداد میں قطعی ناجائز حصہ دار بن جانے کا دعویٰ دائر کیا۔ یعنی حاجی خان کو مکار اور جھوٹا ثابت کر کے خواہش کی کہ چونکہ حاجی خان ہمارے خاندان کا رشتہ دار نہیں ہے۔ صرف والی فیروز پور جھرکہ کے جبر و حکم سے اُسے ہماری جائداد کا حصہ دار بنا دیا گیا تھا۔ اس لئے اس کا حصہ ضبط کر کے مرزا غالب کے خاندان کو واپس دلایا جائے۔ نیز پچھلی کل رقم ۱۸۰۶ء کے حساب کے مطابق یکمشت دلانے کا فیصلہ صادر کیا جائے۔ مرزا صاحب نے اس درخواست میں یہ بھی لکھا کہ نواب احمد بخش خان مرحوم نے لارڈ لیک کے عملہ کو رشوت دیکر جعلی دستاویز

بنوائی تھیں اُسے بھی خارج متصور فرمایا جائے۔

بدقسمتی سے حکومت نے مرزا کی یہ درخواست بھی مسترد کر دی۔ لیکن مرزا نے ہمت نہ ہاری اور مارچ ۱۸۳۶ء میں پھر لارڈ آکلینڈ کی خدمت میں درخواست گذاری۔ اس درخواست میں سیکریٹری اور ریذیڈینٹ کے خلاف شکایت کر کے لکھا کہ ان حکام اعلےٰ نے میرا مقدمہ خراب کر دیا ہے۔ آپ اس کی شکایت فرمائیں۔ اور میری داد رسی فرما کر قدیم پنشن دس ہزار روپیہ بحال فرمائی جاوے۔ لارڈ آکلینڈ نے یہ درخواست بھی داخلِ دفتر کر دی۔ اگست ۱۸۳۷ء میں مرزا نے اپنی بیوی امراؤ بیگم اور سالی بنیادی بیگم کی طرف سے درخواست دی۔ اس درخواست میں سابق وظیفہ کی بحالی اور بقایا کی وصولیابی کا مطالبہ کیا۔ اس کے بعد جولائی ۱۸۳۰ء میں اپنی جانب سے درخواست پیش کی جس میں لکھا کہ میرے معاملے کو دوسرے اقربا کے مقدمہ سے علیحدہ تصور کر کے دونوں کی الگ الگ سماعت کی جاوے۔ اس کا جواب ملا کہ چونکہ مقدمات یکساں نوعیت کے ہیں اس لئے کسی قسم کا امتیازی سلوک ممکن نہیں ہے۔

درخواستوں کا یہ سلسلہ ۱۸۲۷ء سے جاری تھا اور کسی نتیجہ کے بغیر ۱۸۴۰ء تک جاری رہا۔ اس لمبے عرصے میں کئی بار امید کا چراغ جلا کئی بار بجھا اور مرزا صاحب عجیب کشمکش میں گرفتار رہے۔ پنشن کی امید پر قرضہ چڑھتا گیا۔ تیرہ برس کی مسلسل ناکامی کے بعد

بعد ۱۸۴۰ء میں پھر ایک درخواست پنشن کی جس میں سابقہ رقوم اور بقایا کے سلسلے میں مبلغ دو لاکھ تین ہزار کا مطالبہ پیش کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ کمپنی کی حکومت فیروز پور جھرکہ جاگیر ضبط کر چکی تھی۔ ریاست لوہارو کے نئے مارکان جو حکومت کو محبوب تھے کو ناراض کرنا کسی قیمت پر گوارا نہ تھا۔ چنانچہ ان پیچیدگیوں کی وجہ سے حکومت نے یہ درخواست بھی مسترد کر دی مرزا کے سارے منصوبے خاک میں مل گئے۔ مرزا نے اُمید کا دامن نہ چھوڑا۔ ۱۸۴۲ء میں نئے گورنر جنرل لارڈ ایلن برا تشریف لائے۔ مرزا نے قصیدہ لکھکر گذارا اور بعد میں ان کے دفتر میں مظلومیت کی داستان روانہ کی۔ اسی سال ۲۹ر جولائی کو ایک درخواست ملکہ وکٹوریہ کے حضور ارسال کر دی ان سب معروضات کا آخری فیصلہ کورٹ آف ڈائریکٹرز نے سنا دیا کہ ملکہ وکٹوریہ اور ان کی حکومت ہندوستان کے اس فیصلے کو جو مرزا غالب کے حق میں اس سے پیشتر ہو چکا ہے۔ حق بجانب سمجھتی ہے۔ اور اس سلسلے میں نظرثانی غیر ضروری تصور کی جاتی ہے۔ یہ فیصلہ ۱۸۴۴ء میں ہوا۔ روشنی کی آخری کرن بھی غائب ہو گئی اور مرزا کی تیرہ بختی ظلمت آشکار ہوئی۔ ان آلام نے مرزا کو حد درجہ قنوطیت پسند اور الم پرست بنا دیا۔ مرزا کی شاعری میں یہ رنگ نمایاں ہوا ؎

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

کسی سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجیے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں۔ سو وہ بھی نہ ہوا

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں!
چراغِ مُردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

میں نے روکا رات غالب کو وگرنہ دیکھتے
اس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

گریہ چاہے ہے خرابی میرے کاشانے کی
در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

درخورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں
وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جُدا تھا

ہے خونِ جگر جوش میں دل کھول کے رونا
ہوتے جو کئی دیدۂ خوننابہ فشاں اور

★

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

کیا شمع کے نہیں ہوا خواہ اہلِ بزم
ہو غم ہی جاں گداز تو غمخوار کیا کریں

★

جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام
دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

★

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو!
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو!

★

حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی
دل جوشِ گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی
اُس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے
میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتمامی

★

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا!!
کس سے کہوں کہ داغِ جگر کا نشان ہے

★

زندگی اپنی جو اس رنگ سے گذری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

اُگ رہا ہے درو دیوار سے سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

★

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے!!

★

اگرچہ ان آلام نے مرزا کو حد درجہ قنوطیت پسند اور الم پرست بنا دیا تھا۔ لیکن مرزا غالب کے بارے میں یہ کہنا غلط ہے۔ کہ وہ مدح سرائی اور قصیدہ گوئی کے قائل نہیں تھے۔ البتہ وہ مفت کی مدحت طرازی پسند نہ کرتے تھے۔ دہلی میں آکر مرزا نے بادشاہ اکبر شاہ ثانی کے حضور میں ایک قصیدہ پیش کیا تھا۔ لیکن وہاں سے کوئی صلہ نہ ملا چنانچہ اس کے بعد بادشاہ کی زندگی بھر ایک شعر بھی ان کی حمد و ستائش میں نہ کہا۔ مرزا صاحب اس معاملہ میں کبھی بھی بے نیاز نہ ہوسکے تھے۔

آپ کا یہ شعر ہے ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پرواہ
گر نہیں ہیں میرے اشعار میں معنی نہ سہی

مرزا صاحب کے مزاج کے خلاف ہے۔ دہلی میں آنے کے بعد جس قدر میدانِ شعر و سخن میں گھوڑے دوڑائے۔ وہ اس منزل تک پہنچنے کے لئے تھے جہاں پہنچکر کچھ حاصل ہوتا ہے۔ اور اگر کبھی کسی منزل سے خالی دامن لوٹنا پڑا تو چیں بہ جبیں ہو کر کہہ دیا ؎ غ۔

کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

اور اگر کسی شاہ و اقتدار کے دربار میں خاطر خواہ حوصلہ افزائی اور قدر و منزلت نہ ہوئی تو بہ انداز شکایت کہہ دیا کہ ؎

پشت سے پیشہ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

جب ۱۸۳۷ء میں ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر تخت نشین ہوئے اور مرزا غالب لال قلعہ میں سلام کے لئے حاضر ہوئے تو مرزا نے شاہ کی شان میں قصیدہ گزارا۔ سخن پرور اور قدر شناس بادشاہ نے خلعت و انعام سے سرفراز فرمایا۔ جب اس طرح اس دربار میں مرزا کی حوصلہ افزائی ہوئی تو پھر مرزا کو سوائے مدح سرائی کے کچھ کام ہی نہ تھا۔ پھر تو مرزا نے قصائد کے دفتر پیش کر دیئے۔ بادشاہ کی طبیعت علیل ہوئی تو دعائیں مانگنے بیٹھ گئے۔ صحت ہوئی تو جشن صحت منانے لگ گئے۔ جب سے ظفر بادشاہ ہوئے۔ غالب بزم شاہی میں شعر خواں نظر آنے لگے۔ اُس وقت بادشاہ کے استاد شیخ محمد ابراہیم ذوق تھے۔ لیکن سخن فہم بادشاہ دوسرے اہلِ کمال ارباب علم و فن کی بھی قدر و منزلت فرماتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ ذوق کے ہوتے مرزا کو دربار شاہی میں اپنے علمی اور شعری فضائل کے سبب خاصا

رسوخ حاصل ہو گیا تھا۔

۱۸۴۵ء کا زمانہ ہے۔ مرزا غالب کی عمر ۴۸ برس کی ہو چکی ہے۔ مفتی صدر الدین آزردہ سے بہت قریبی مراسم پیدا ہو چکے ہیں۔ مفتی صاحب دل کی گہرائیوں سے مرزا کی قدر کرتے تھے اور اکثر انہی کے دیوان خانے میں شعر و سخن کی محفل جمتی تھی۔ ایک شام اسی دیوان خانے میں چند ارباب علم و ذوق جمع ہیں۔ ان میں نواب شیفتہ۔ سید الطاف حسین حالی۔ مولانا فضل حق خیر آبادی۔ اور دوسرے احباب بھی شریک ہیں۔ شعر و سخن کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ تذکرہ کا موضوع مرزا غالب کی فارسی اور اردو شاعری ہے۔ مفتی آزردہ صاحب کہتے ہیں کہ مرزا صاحب فارسی میں باغ و بہار دکھاتے ہیں۔ حالی کہتے ہیں کہ اردو میں نقش ہائے رنگ رنگ کی کمی نہیں ہے۔ شیفتہ صاحب بھی حالی سے متفق ہیں۔ اور قدر شناس لوگوں کی ذہنیت پر افسوس کر رہے ہیں۔ جو مرزا کے کلام کے بارے میں کہتے ہیں ؎

کلام میر سمجھے یا کلام میرزا سمجھے
مگر اپنا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

★

آزردہ فرماتے ہیں کہ مرزا نے اردو شاعری کو بیدل کا رنگ بہار بخشا ہے۔ اس حقیقت کو مرزا نے خود تسلیم کیا ہے۔

؎

اسد ہر جاں سخن نے طرح باغ تازہ ڈالی ہے
مجھے رنگِ بہار ایجادیِ بیدلؔ پسند آیا!!

آشفتہؔ صاحب نے کہا۔ انہی لوگوں کی ذہنیت پر ماتم کرتے ہوئے مرزا صاحب نے کہا ہے ؎

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات
دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھکو زبان اور

★

ہرگوپال تفتہؔ نے کہا۔ یہ ستم ظریف لوگ، ہمارے محترم مرزا صاحب کا مقام کیا سمجھیں انہیں سمجھانے کے لئے مرزا صاحب نے فرمایا ؎

ہوں ظہوریؔ کے مقابل میں خفائی غالبؔ
میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

★

آزردہؔ نے کہا۔ کیا خوب وقت پہ مجھے اسد خان کا شعر یاد آیا ہے ؎

امامِ ظاہر و باطن امیرِ صورت و معنی
علی ولی اسد اللہ جانشینِ نبیؐ ہے

★

حالیؔ نے کہا۔ مرزا کا وہ مقطع تو آپ کو یاد ہوگا ؎

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

★

آشفتہ نے کہا۔ مرزا صاحب کی وہ رباعی تو میرے دل پر نقش ہو کر رہ گئی ہے ؎

رُباعی

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سُن سُن کے اُسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

★

سلسلہ گفتگو جاری تھا کہ مرزا غالبؔ بھی تشریف لے آئے۔ آشفتہ نے مرزا کو دیکھ کر کہا۔ آیئے مرزا صاحب آپ ہی کا ذکر خیر ہو رہا تھا مرزا صاحب نے مسکرا کر کہا۔

ع

تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے

★

محفل میں قہقہے گونج اُٹھے۔ مرزا صاحب نے بیٹھتے ہی حقہ، طلب کیا۔ آزردہ نے اپنے ملازم کو حکم دیا کہ حقہ لے آؤ۔ پھر مرزا کی شاعری کا ذکر چھیڑا تو مرزا نے کہا۔

" بھئی دوستوں سے میرا کون سا معاملہ پوشیدہ ہے۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ بندہ نے ابتدائے سنِ تمیز میں اُردو زبان میں سخن سرائی کی ہے۔ پھر اوسط عمر میں آپ کے سامنے آپ کے دیار میں اس روش میں خامہ فرسائی کی ہے۔ نظم و نثر فارسی کا عاشق و مائل ہوں۔ ہندوستان میں رہتا ہوں۔ مگر تیغِ اصفہانی کا گھائل ہوں۔"

سب نے درست بجا کہا۔ مرزا نے کہا۔
کسی دن سن لوگے۔

ع۔ مر گیا غالب آشفتہ نوا کہتے ہیں

٭

آزردہ نے قدرے غمگین ہو کر کہا۔ مرزا جی آپ کو یہ سنکر صدمہ ہوگا کہ ہمارا یار مرزا فانی کوتوال شہر کا تبادلہ ہوگیا ہے۔ دہلی سے کانپور جا رہا ہے۔ اور کانپور سے کوئی صاحب اکرام علی دہلی تبدیل ہو کر آرہے ہیں۔ مرزا نے کہا۔ بھائی یہ تو اچھی خبر نہ سنائی آپ نے۔ یہ تو بڑا غضب ہوا۔ مرزا فانی کی جدائی تو شاق ہو گی۔ لیکن جس شخص کا آپ نے نام لیا ہے۔ وہ تو گنہگار ہے تعجب ہے کہ اب تک کوتوال ہی

ہے۔ جب میں آگرے سے دلی آیا تھا۔ اس وقت یہ شخص وہاں نیا نیا کوتوال ہوا تھا۔ بڑا بے مروت آدمی ہے۔ مولینا فضل حق کچھ چپ چپ سے بیٹھے تھے۔ مرزا نے ان سے پوچھا۔ کیوں مولینا آپ کچھ افسردہ سے معلوم ہوتے ہیں؟ خیریت تو ہے؟

مولینا نے جواب میں کہا۔

میں عنقریب اس محفل احباب سے جدا ہونے والا ہوں۔ اور دربار اودھ کی ملازمت میں جانے والا ہوں۔ اس انجمن کی رونق سے جدا ہونے کا تعلق ہے۔ مرزا نے کہا آپ لکھنؤ جا رہے ہیں یہ تو خوشی کی بات ہے ہماری یاد سے وابستہ کا ذریعہ وہاں کے ثمر بہشت ہیں۔

اس پر سب ہنسنے لگے۔ میں نے کہا غم نہ کھائیں۔ میں وہاں پہنچتے ہی آموں کا ڈھیر لگا دوں گا۔ مرزا نے ہنسکر کہا۔ لیکن یہ ڈھیر کہاں لگائے جائیں گے؟ آپ کے سامنے یا کوچہ بلی ماراں میں! اس پر مولینا نے ہنس کر کہا۔ دربار پر آشفتہ نے کہا۔ مرزا صاحب مولینا کے ہاں محفل مشاعرہ منعقد ہو رہی ہے۔ محفل آپ کی رخصت کی تقریب میں ہے۔ بھول نہ جائیے تشریف لائیے۔ مرزا نے کہا۔ میں اور مولینا سے تغافل برتنے کی گستاخی کروں۔ ایک نہیں بے شمار محرومیاں نصیب ہوں گی۔ بزم سے محرومی مفتی صاحب کے اشعار سننے سے محرومی مولانا کی صدارت سے محرومی۔ یہ تو بتایئے کہ حکیم مومن خاں بھی آ گئے۔! شیفتہ صاحب نے کہا۔ میں کوشش کروں گا۔ مرزا

نے کہا کوشش نہیں انہیں ضرور لے آیئے۔ یاروں کا یار ہے۔ بڑا طرحدار ہے۔ ہماری طرح اس غریب کو بھی عشق نے مار ڈالا ہے۔ کیتا بھی تو خوب ہے۔ وائے رے زمانہ۔ یہ چند صورتیں غنیمت ہیں۔ یہ صحبتیں خدا جانے کب تک رہیں اور کب بچھڑ جائیں۔

چند روز بعد مولینا فضل حق کے مکان پر محفل مشاعرہ منعقد ہوئی۔ مرزا غالب، مومن خاں مومن۔ مولینا آزردہ۔ امام بخش صہبائی اور چند نوجوان شعرا۔ الطاف حسین حالی۔ اور تفتہ وغیرہ شریک ہوئے۔ مولینا فضل حق صدر تھے اور شیفتہ میر شاہ۔ سفید چاندنی کا فرش بچھا ہوا تھا۔ فانوس کی روشنی سے محفل منور تھی۔ پان الائچی چکنی ڈلی۔ اور پیچواں شعرا کے سامنے تھے۔ صدر مشاعرہ سامنے وسط میں گاؤ تکیہ کے ساتھ لگے مسند پر بیٹھے تھے۔ شمع کا دور جاری ہوا۔ پہلے میر مشاعرہ نے چند شعر پڑھے۔ پھر جو شعرا نے باری باری اپنا کلام سنایا۔ پھر اساتذہ کے سامنے شمع لائی گئی۔ پہلے خود میر مشاعرہ جناب شیفتہ نے کلام سنانا شروع کیا۔ اور کہا۔ شعر عرض کرتا ہوں۔

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

دوسرا شعر عرض کیا ہے ؎

نفسِ سرکش کی کسی ڈھب سے رعونت کم ہو
چاہتا ہوں وہ صنم جس سے محبت کم ہو

سنئے مرزا صاحب شعر عرض کرتا ہوں ؎

ہم طالب شہرت ہیں ہمیں ننگ سے کیا کام
بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

مرزا صاحب نے اس شعر پر جھوم جھوم کر داد دی اور تین چار مرتبہ پڑھوایا۔ پھر شیفتہ صاحب نے دوسرا شعر پڑھا ہے ؎

فانوس و شیشہ و لگن زار سے کیا حصول
وہ ہے وہاں جہاں نہیں روغن چراغ

★

شیفتہ صاحب نے مولینا فضل حق سے کہا۔ شعر سنئے مولینا ؎

کس تغافل سے یہ کہتا ہے کہاں رہتے ہو
تیرے کوچے میں ستمگار تیرے کوچے میں

★

آخری شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی

★

اب شمع حکیم مومن خاں مومن کے سامنے آئی۔ مومن نے مرزا صاحب کو مخاطب کر کے کہا۔ غزل کا مطلع عرض کیا ہے مرزا صاحب۔

؎

اگر غفلت سے باز آ جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

تعریف کا شور مچ گیا۔ مرزا صاحب اور تفتہ نے بہت تعریف کی ۔

مومن نے اپنی زلفیں سنوارتے ہوئے کہا۔ شعر عرض کرتا ہوں ۔

موئے آغاز الفت میں ہم افسوس
اُسے بھی رہ گئی حسرت جفا کی
غم مقصد رسی تا نزع اور ہم
اب آئی موت بخت نارسا کی
صبا نے اس کے کوچے سے اُڑا کر
خدا جانے ہماری خاک کیا کی

اس شعر پر پھر تعریف کا شور اُٹھا۔ مومن نے شعر پڑھا ۔

کہا ہے غیر نے تجھ سے مرا حال
کہے دیتی ہے بے باکی ادا

مومن نے مرزا سے کہا۔ شعر توجہ کا مستحق ہے مرزا صاحب ۔

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

اس شعر پر داد کا وہ شور مچا کہ طوفان برپا ہو گیا۔ بار بار پڑھوایا گیا۔ مومن نے شعر پڑھا ۔

دیا علم و ہنر حسرت کشی کو
فلک نے مجھ سے یہ کیسی دعا کی

مومن نے کہا۔ مقطع پیش خدمت ہے ۔

کہا اس بُت سے جو مرتا ہے مومن
کہا میں کیا کروں مرضی خدا کی

★

واہ وا۔ بہت خوب۔

اب شمع صاحب کے سامنے آئی تو مرزا غالب نے ہاتھ بڑھا کر شمع اپنے سامنے کرلی۔ اور کہا۔ پاس ادب مانع ہے۔ بزرگوں کے بعد ہم کیا خاک پڑھیں گے! مرزا نے آزردہ صاحب سے مخاطب ہو کر کہا۔ ایک تازہ غزل کے چند اشعار عرض کروں گا۔ مطلع پیش خدمت ہے۔

مطلع غزل

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

آزردہ نے کہا۔ مطلع خوب ہے ہم داد دیتے ہیں۔ لیکن باقی شعر ترنم میں فرمائیے۔ چنانچہ مرزا نے اپنے خاص انداز میں با ترنم پڑھنا شروع کیا۔

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے

★

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منتِ درباں کیے ہوئے

★

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے!!
غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

★

ہر شعر کئی کئی بار پڑھوایا گیا۔ خوب داد ملی۔ اب شمع مولانا آزردہ کے سامنے آئی۔ اور مرزا صاحب نے کہا۔ ارشاد ہو مولانا صاحب۔ آزردہ نے کہا۔ غزل کے چار شعر یاد ہیں۔ عرض کئے دیتا ہوں۔

اے بلبلانِ شعلہ دم اب نالہ اور نہیں
گم کردہ راہِ باغ ہوں یادِ آشیاں نہیں
اٹھ کر سحر کو سجدۂ مستانہ کے سوا
طاعت قبولِ خاطرِ پیرِ مغاں نہیں
ناز و نگہ روش سب ہی لاگو ہیں جان کے
ہے کونسی ادا تیری جو جاں ستاں نہیں

آزردہ نے پڑھی وہ غزل میکدے میں کل
وہ صاف ترکہ سینۂ پیر جواں نہیں

مرزا نے کہا۔ اچھا بھئی مجھے تو اجازت دیں۔ آزردہ نے پوچھا وہ کیوں؟ مرزا نے کہا۔ غزل کی چاشنی کے بعد منہ کا مزہ بدلنا ضروری ہوتا ہے۔ فضل حق صاحب سمجھ گئے ہنس کر کہا۔ یہیں حاضر کر دوں۔ مرزا نے مسکرا کر کہا۔ نیکی اور پوچھ۔ لیکن صدر مشاعرہ سے گذارش ہے کہ میر مشاعرہ کو روک لیں۔ آج انہی کی امامت میں سہی۔ فضل حق اور آزردہ ہنس پڑے اور کہا۔ آپ قیام فرمائیں ہمیں سجدہ کی اجازت دیں۔ اذان ہو چکی ہے۔

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب

۱۸۴۷ء کا زمانہ ہے۔ مرزا کی عمر پچاس برس کی ہو چکی ہے۔ جوانی کا چراغ گل ہو چکا ہے۔ بڑھاپے کی سپیدی نمایاں ہے۔ لال قلعہ سے برائے نام کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے۔ دربارِ ظفر میں ذوق کا سکہ رواں ہے۔ غالب بوجہ تنگدستی پریشان ہے۔ مرزا صاحب گھر سے بہت کم نکلتے ہیں۔ چنانچہ دیوان خانے میں شطرنج چوسر اور گنجفہ ترقی پر ہے۔ شب و روز بازی لگتی ہے۔

ایک دن احباب کی یہ محفل گرم تھی۔ کہ ملازم نے آکر خبر دی کہ ایک خاتون حضور سے ملاقات کی طلبگار ہے۔ مرزا صاحب گھبرائے کہ یہ کون مہمان آئے۔ مرزا صاحب نے حیرت سے کہا۔ خاتون اور اس بڈھے سے ملنے کا شوق لے کر آئی ہے۔ سب ہنس دیئے۔ پھر خیال آیا کہ شاید کوئی حاجت مند ہو گی۔

ایک دوست نے کہا۔ اگر کوئی حاجت مند ہے تو اسے دوسرا

دروازہ دکھایئے۔ یہاں تو پہلے ہی حاجت مند بیٹھے ہیں اور پھر ؎

کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

★

مرزا نے دوستوں کو دوسرے کمرے میں جانے کے لئے کہا۔ اور ملازم سے کہا کہ اُسے اندر بھیجدو۔ اتنے میں ایک انگریزی فیشن کی دلدادہ مس گوری چٹی عمر ڈھلی ہوئی۔ لیکن شباب سنبھالا ہوا۔ دہرا جسم سڈول ہاتھ پاؤں اندر آئی۔ مرزا نے اسے دیکھا۔ حیرت میں ڈوب گئے۔ پہچان نہ سکے۔ پھر دیکھا۔ خوب دیکھا بغور دیکھا لیکن نہ پہچانا۔ عورت نے کہا۔ وقت کے جانے سے کیا جان پہچان گئی۔ مرزا اور الجھن میں پڑ گئے۔ عورت نے کہا۔ اس وقت میں آپ کے پاس مہمان آئی ہوں۔ فرمایئے تو بیٹھ جاؤں۔ مرزا نے سبکی محسوس کی اور کہا۔ تشریف رکھئے۔ میرے آداب و سلیقہ بھی میرے ساتھ حیرت میں گم ہو گئے ہیں۔ اس کی معافی چاہتا ہوں۔

عورت نے کہا۔ حضور یہ مداخلت بیجا ہے۔ اور بلا اجازت حاضری بے ادبی ہے۔ مگر دو باتیں کرنے کی طالب ہوں۔

مرزا صاحب گھبرا گئے ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ ہزار ذہن پر زور دیا۔ لیکن یادداشت نے رہنمائی نہ کی۔ بہت دیر کے بعد شبہ ہوا کہ یہ صورت کچھ جانی پہچانی سی ہے۔ پھر خیال آیا کہ وہ یہاں کہاں عورت زیر لب مسکرائی اور کہا۔

آپ نے تو مجھے کاہے کو پہچانا ہوگا۔ جس رام کلی کو آپ جانتے ہیں وہ تو آگرہ میں اپنے شباب کے ساتھ مر چکی ہے۔ میں اس کی لاش اٹھائے اٹھائے پھر رہی ہوں۔ اب مرزا صاحب کو معلوم ہوا کہ یہ تو رام کلی ہے۔ مرزا صاحب نے فرط مسرت سے کہا۔ آخا۔ رام کلی تم۔ تم یہاں کب سے؟ کہو خیریت سے تو ہو۔ کیا خوب نظر بد دور۔ سورج ڈھلنے پر شفق میں اور سرخی آ گئی ہے۔ رام کلی نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ مجھے یہاں آئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے۔ کئی بار جی چاہا کہ حضور کے نیاز حاصل کروں لیکن حضور کی نفرت نے اجازت نہ دی۔

مرزا نے کہا۔

دبی چنگاری کریدنے سے کیا حاصل۔ یہ بھولی بسری کہانی ہے۔ اب اس کا ذکر بیکار ہے۔ رام کلی نے کہا۔ ذکر تو ہمیشہ بیکار رہا ہے۔ مرزا نے کہا۔ کیا تم اس کھوئی ہوئی داستان کو تلاش کر کے لائی ہو اور اس کی انتہا سے ابتدا کرنا چاہتی ہو رام کلی نے کہا۔ حضور۔ ہم پیشہ ور عورتوں کی ابتدا کیا اور انتہا کیا۔

مرزا۔ بہت خوب ہو تم۔

رام کلی۔ کبھی تھی۔

مرزا۔ یہ تھی کیا کہا؟ تم تو اب بھی ایک حسین اور شاندار عمارت ہو۔

رام کلی۔ (مسکرا کر) کھنڈر کہیے حضور۔ پھر اس نے گردن جھکا لی اور محو ہو گئی۔

مرزا۔ کہاں کھو گئی ہو؟
رام کلی۔ گذشتہ ایام کے تصور میں محو ہونے لگی تھی۔
مرزا۔ اب بھی قیامت سے کم نہیں ہو۔ کلی کھل کر پھول بنتی ہے کوئی ہم سے پوچھے ؎

نہ شعلہ میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتائے کہ وہ شوخِ تند خو کیا ہے

★

رام کلی۔ میں تو اپنی اماں کی جان کو روتی ہوں۔ جس کمبخت نے میری حسرتوں کی دنیا بدل دی۔
مرزا۔ اب ان باتوں کو رہنے دو۔ وقت گیا بات گئی۔ اب اس زمانے کا تذکرہ کیا۔ جس کی لکیر باقی رہ گئی ہو۔ ویسے اس بڈھے کو ستانا چاہتی ہو تو جو چاہے کہو۔ زخم پہ نمک پاشی کرو ہم بُرا نہ منائیں گے۔
رام کلی۔ حضور کو میری کسی بات کا رنج پہنچا ہو تو معافی کی خواستگار ہوں۔ بھلا میری یہ جرأت کہاں؟
مرزا۔ یہ بھی ایک طرح کا چھیڑ ہی ہوا۔ ہمیں اپنی رام کلی کی بات سے رنج ہو گا؟ بخدا ہمارے لئے جو کچھ تم پہلے تھیں۔ سو اب بھی ہو۔ بلکہ مختصر یہ کہ کچھ زیادہ ہی ہو۔
رام کلی یہ جملہ سُنکر عجیب شرمیلے انداز میں نظریں جُھکا کر

خاموش ہو گئی۔ نہ جانے اسے کیا کیا وقت یاد آ گئے۔ مرزا صاحب نے اپنے محبوب کو پھر پہلی سی نظروں سے دیکھا۔ اور کہا ؎

مرزا۔ "رام کلی" یقین مانو تمہاری محبوبانہ ادائیں اس عہد میں بھی دشمنِ صبر و قرار ہیں۔

رام کلی۔ ماشاء اللہ۔ کیا دل پایا ہے۔ اور دل نے کیا جذبہ دل پایا ہے۔

مرزا۔ داد دیتے ہیں ہم۔ کیا نثر میں شاعری کرتی ہو۔ ورنہ یہاں تو سب کچھ لٹ چکے۔ ایک جانِ زار باقی ہے۔ ؏

رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

رام کلی۔ وہ رہزن بھی کیا خوب تھی۔ جانِ وفا تھی کہ جانِ دیگر حق ادا کر دیا۔

مرزا۔ کس کا ذکر لے بیٹھی ہو؟

رام کلی۔ عاشقی میں مر جانے والی الٰہی جان کا۔

مرزا۔ خیر جانے دو ان باتوں کو۔ بتاؤ کس کام کے لئے تکلیف کی ہے؟

رام کلی۔ ایک بار آپ کو کانپور کے زمانہ میں بتا چکی ہوں۔ کہ وہ آگرہ کا کوتوال اکرام علی آپ کی آبرو کا دشمن ہے۔ وہ کینہ پرور انتقام کے جذبے کو سینے سے لگائے پھرتا ہے۔

میں نے اس کمینے کی خاطر آگرہ چھوڑا تھا۔ اور کانپور چلی گئی تھی۔ وہ وہاں بھی پہنچ گیا تھا۔ اور تھانیدار ہو کر چوکی میں پہونچ گیا تھا۔ میرے گھر سے اس نے ربط پیدا کیا اور میرے پیچھے پڑا رہا۔

مرزا۔ وہ تم سے چاہتا کیا تھا۔

رام کلی۔ سب کچھ۔

مرزا۔ بہت خوب۔ بڑا کمینہ اور سفلہ آدمی ہے۔

رام کلی۔ اب اس کا تبادلہ یہاں دہلی میں ہو گیا ہے۔ اور وہ ترقی پاکر یہاں آگیا ہے۔ وہ مجھے بھی کانپور سے دہلی لے آیا ہے۔ مجھ پر اُس کا بہت بڑا احسان ہے۔ میں ہر چند چاہتی تھی کہ کانپور چھوڑ کر دہلی آن رہوں۔ مگر وہ رضامند نہ ہوتا تھا۔

مرزا: دہلی تمہیں اس قدر کیوں پسند تھی۔؟

رام کلی۔ ہر بات کا جواب دوسرے سے نہیں لیا کرتے۔ ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ وہ مجھے دہلی لے آیا ہے اور اب میں چاوڑی بازار میں کرائے کے مکان میں رہتی ہوں۔ پرسوں وہ میرے گھر آیا۔ اس کے ساتھ دو سپاہی بھی تھے۔ وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ان کی زبان پر آپ کا ذکر بھی آیا۔ کچھ جوئے بازی کی بات بھی ہوئی۔ وہ بدبخت ان پولیس والوں کو آپ کے پیچھے لگا رہا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتی اس نے کیا منصوبہ باندھا ہے۔ میں نے آپ کا اتا پتا معلوم کر لیا۔ اور آپ کو آگاہ کرنے کے لئے چلی آئی۔

مرزا۔ یہ دوسرا احسان ہے۔ جو تم نے مجھ نامراد پر گوارا کیا ہے۔ مگر حیرت ہے وہ شخص تمہارے مکان پر آکر تمہاری موجودگی میں ایسی رازدارانہ باتیں کرتا ہے۔

رام کلی۔ وہ تو مجھے آپ کا دشمن سمجھتا ہے۔ اس لئے مجھ پر اُس کا

کوئی شبہ نہیں ہے اور پھر ہمارے گھر ان لوگوں کی عیارانہ سازشوں کے اڈے ہوتے ہیں وہ سمجھتا ہے کہ میں آپ سے نفرت کرتی ہوں۔ ظالم کہیں کا۔ اچھا حضور اب اجازت دیں۔ حضور کی قیام گاہ معلوم ہوگئی۔ پھر کبھی آؤں گی۔

مرزا رام کلی کے جانے کے بعد دیر تک اس کے بے غرض ہمدردی کے اظہار پر غور کرتے رہے۔ پھر گم گشتہ زندگی ایک ایک ورق اُلٹ اُلٹ کر غیر محسوس انداز میں پڑھتے رہے۔ رام کلی کی دلبرانہ محبت نے ایک کیف زا حسین و جمیل دنیا آباد کردی۔ دوسرے کمرے میں دوست چھپے بیٹھے تھے۔ مرزا نے انہیں آواز دیکر بُلا لیا۔ اور دل کو بہلانے لگے۔

اسبابِ گرفتاریِ خاطرِ مت پوچھ

شہر میں ان دنوں قمار بازی کا بہت چرچا تھا۔ اکرام کوتوال کے ہاتھوں شہر کے معزز لوگ سخت نالاں تھے۔ کوتوال بڑا سخت گیر اور کمینہ فطرت تھا۔ اس نے قمار بازی کی شہرت سن کر اعلیٰ حکام سے ان جرائم کے انسداد کا ذمہ لیا تھا۔ اور اس شرط پر کہ کوئی افسر بالا تفتیش اور معاملہ میں دخل اندازی نہیں کرے گا۔ کوتوال کی رپورٹ تھی کہ دلی شہر میں اکثر ہندو مسلمان رؤسا کے گھروں میں قمار خانے کھلے ہوئے ہیں۔ اور وہ رئیس لوگ اپنے اثر و رسوخ سے اپنے ہاں قمار بازی کراتے ہیں۔ اس کوتوال نے اکثر صاحب اثر امیر لوگوں سے اس جرم میں سزایاب کرایا تھا۔ شہر کا مجسٹریٹ کنور نور دز علی خاں دادن پور ضلع بلند شہر کا رئیس، اور انگریز حکومت کا بڑا معتمد تھا۔ وہ بھی حال ہی میں میرٹھ سے تبدیل ہو کر دلی آیا تھا۔ اُسے شہر کے معززین سے بہت کم آگاہی تھی۔ اور مرزا غالب سے بھی ابھی رسم و راہ

نہیں تھی۔ کوتوال ہر وقت مرزا غالب کو نقصان پہنچانے کے منصوبے سوچتا رہتا۔ اس نے اپنے خفیہ عملہ کے ذریعہ معلوم کر لیا کہ مرزا کے ہاں بھی چوسر اور گنجفے کا سلسلہ جاری ہے۔ تو اس نے کڑی نگاہ رکھنے کے لئے مرزا پر اپنے جاسوس مقرر کر دیئے اور انہیں سمجھا دیا کہ ایسے وقت کے انتظار میں رہیں جب مرزا کے ہاں یہ کھیل کھیلے جا رہے ہوں اور بازی ہو رہی ہو۔ اسی وقت ہمیں اطلاع کرو اور یہ بھی تاکید کر رکھی تھی کہ ایسے وقت میں ہمارے جاسوس بھی اس کھیل میں شریک رہیں۔

اور جب ہم چھاپہ ماریں تو وہ وہاں سے بھاگ نکلیں۔ جون کا مہینہ تھا۔ چلچلاتی دوپہر تھی۔ کہ جاسوس نے جا کر کوتوال کو خبر دی کہ موقع ٹھیک ہے۔ مرزا کے ہاں کھیل جما ہوا ہے۔ روپوں کا ڈھیر سامنے لگا ہوا ہے۔ ہمارے دو آدمی بھی شریک محفل ہیں۔ کوتوال نے اسی وقت چند سپاہی ساتھ لئے اور جا کر مرزا کے مکان کو گھیر لیا۔ مرزا صاحب گھیراؤ میں آ گئے۔

پیسے کا لین دین ہو رہا تھا۔ مرزا گاؤ تکیہ لگائے بازی دیکھ رہے تھے۔ کوتوال دیوان خانے میں چلا گیا۔ پولیس کو دیکھ کر کھلبلی مچ گئی۔ جاسوس فرار ہو گئے۔ مرزا اور ان کے یار دوست پولیس کے گھیراؤ میں آ گئے۔ کلو نے روتے چیختے زنانخانہ میں جا کر بی وفادار کو اطلاع کی وہ سر پیٹنے لگی۔ بیگم بدحواس ہو کر رونے لگی۔ کوتوال نے مرزا صاحب

کو معہ دوستوں کیساتھ گرفتار کر لیا اور ان سب کو ہتھکڑی لگاکر کوتوالی لے گیا۔ مرزا کو کھلی گاڑی میں لے جایا گیا۔ تاکہ سر بازار ان کی خوب رُسوائی ہو اور مرزا کو جس شان و شوکت اور آبائی عزت پر مان تھا۔ اس کے پُرزے اُڑیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جس جس بازار اور سڑک سے گزرے جا رہے تھے لوگ اُنگلیاں اُٹھا رہے تھے۔ کوئی کہہ رہا تھا۔

لوہارو خاندان کے داماد پر ہاتھ ڈالنا آسان کام نہ تھا۔ لیکن یہ کوتوال بڑا جی دار ہے۔ اس نے بڑے بڑوں کو حوالات پہنچا دیا ہے۔ کسی کی زبان پر تھا۔ لو میاں مرزا صاحب بھی دھر لئے گئے۔ ہاں بھئی بکرے کی ماں کب تک خیر منائے۔ گھر پر جوا کا اڈہ قائم کر رکھا تھا۔ قمار بازی کا سلسلہ چل رہا تھا۔ شراب کا کاروبار بھی تو ہوتا تھا۔ کسی وقت کہیں سے نہ ملے مرزا کے ہاں چلے جاؤ مل جائے گی۔ دوسرے ہی دن کوتوال نے مرزا اور ان کے ساتھیوں کا مجسٹریٹ کی عدالت میں چالان پیش کر دیا۔

ادھر مرزا کے خاندان میں شور مچ گیا۔ دشمن شاد۔ ناشاد ہوئے۔ امراؤ بیگم نے اپنے عزیز و اقارب کے ہاں پہنچکر واویلا مچا دیا۔ چنانچہ ان رشتہ داروں نے بادشاہ کے دربار میں عرض معروض کی بہادر شاہ ظفر خود بھی مرزا کے معترف تھے۔ قدردان تھے۔ وہ اس حادثہ پر سخت خاطر ہوئے۔ چنانچہ شاہ نے بذاتِ خود ریذیڈنٹ کے پاس سفارش کی کہ مرزا نمالب خاندانی رئیس ہیں۔ معزز شہری ہیں اہل علم و فضل ہیں۔

آج علم وادب میں ان کا ثانی نہیں ہے۔ یگانۂ زمانہ ہیں لحاظ کر کے انہیں اور ان کے ساتھیوں کو باعزت رہا کر دیا جائے۔ کیونکہ مرزا کی گرفتاری کسی غلط فہمی اور فتنہ پردازی کی بنا پر ہے۔

جب یہ سفارش انگریز ریذیڈنٹ کے پاس پہنچی اور مرزا کے عالی نسب ہونے کا علم ہوا تو ریذیڈنیٹ نے کوتوال کو طلب کیا۔ کوتوال نے حاضر ہو کر کہا کہ مقدمہ عدالت میں پیش ہو چکا ہے۔ اس میں اگر حکومت نے مداخلت کی تو قانون وضابطہ کی خلاف ورزی کیجائیگی۔ دوسرے لوگ حکومت کے رویّہ سے بدظن ہو جائیں گے۔ اس میں کسی قسم کی سفارش کارگر نہیں ہونی چاہیئے۔ حضور بادشاہ سلامت کو لکھ بھیجیں کہ عدالت سے جو فیصلہ ہوگا۔ ہم سب اس کے پابند ہیں۔

مجسٹریٹ کو مرزا صاحب کے خاندانی حالات کا علم نہ تھا اور نہ ہی یہ معلوم تھا کہ کوتوال مرزا سے پرانی پرخاش رکھتا ہے۔ چنانچہ کوتوال نے حکومت کو یقین دلایا کہ مرزا اسداللہ خاں غالب ایک اوباش بگڑا رئیس ہے۔ وہ شہر میں علم وادب کی بدولت بہت ذی اثر ہے۔ اور لوہارو خاندان میں خسرال کا رشتہ ہونے سے بادشاہ تک رسائی حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مرزا کی سفارش کے لئے قلعہ معلیٰ سے سلام پہنچا ہے۔ اگر یہ مقدمہ سزایاب نہ ہوا تو شہر کے انتظام میں بہت بڑا خلل واقع ہو جائے گا۔ امن عامہ خطرے میں پڑ جائیگا۔ پھر سرکش لوگ شہر میں اودھم مچاتے پھریں گے۔

ریذیڈنٹ کی سرد مہری دیکھ کر مرزا کے عزیز و اقارب نے بھی اس معاملہ سے ہاتھ کھینچ لیا کہ معاملہ ذلت آمیز ہے کہیں وہ بھی شریک جرم تصور نہ کر لئے جائیں۔ ریاست لوہارو کے نوابین کا طرز عمل بے حد افسوس ناک تھا۔ وہ اکثر کنارہ کش ہو گئے۔

مقدمہ عدالت میں پیش ہوا تو مرزا غالب کی جانب سے صفائی میں یہ عذر پیش کیا گیا کہ چوسر کا کھیل محض تفریح طبع کی خاطر تھا۔ اور ذرا دل لگی کے لئے تھوڑی سی بازی لگائی گئی تھی۔ دشمنوں نے اسے قمار بازی کا رنگ دیدیا ہے۔ حکومت متوقع تھی کہ مرزا کے معاملہ میں شہر کے رئیس لوگ اور لوہارو خاندان کے معززین عدالت میں مرزا کی حمایت لیکر ضرور آئیں۔ اس وقت عدالت کو مرزا کی حمایت کا موقع مل جائیگا لیکن ان تمام لوگوں کی خاموشی نے مرزا کو مجرم ثابت کرنے کی دلیل پیش کی۔ مقامی اخباروں میں یہ افسوسناک خبر جلی سرخیوں میں شائع ہونے لگی۔

مرزا غالب سخت پریشان تھے۔ سوچ رہے تھے کہ سسرالی رشتے دار کیا کہیں گے۔ بیگم کی زبوں حالی الگ ستا رہی تھی رام کلی کا خیال الگ جی جلا رہا تھا۔ یار دوستوں کی بے گناہی بیتاب کر رہی تھی۔

مرزا نے حوالات کی کوٹھری میں یہ شعر کہے۔

کوئی امید بر نہیں آتی!
کوئی صورت نظر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی
داغِ دل گر نظر نہیں آتا
بُو بھی اے چارہ گر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی
کعبہ کس مُنہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

ایک روز ۲؍جولائی ۱۸۴۷ء کے فارسی اخبار (احسن الاخبار) میں یہ خبر شائع ہوئی۔

" مرزا اسداللہ خان غالبؔ پر عدالت فوجداری میں جو مقدمہ دائر تھا اس کا فیصلہ سُنا دیا گیا۔ مرزا صاحب کو چھ ماہ کی قید بامشقت اور دو سو روپے جرمانہ کی سزا ہوئی ہے۔ اگر دو سو روپے جرمانہ کی رقم ادا نہ

کریں تو چھ ماہ قید میں اور اضافہ ہو جائے گا۔ مقررہ جُرمانہ کے علاوہ اگر پچاس روپے زیادہ ادا کر دیں تو "مشقت" کم ہو جائے گی۔"

یہ خبر پڑھ کر امراؤ بیگم پر قیامت گذر گئی روتے روتے آنکھیں سوج گئیں۔ کھانا پینا چھوٹ گیا بیگم کو اپنے رشتہ داروں کی بے مہری نے سخت صدمہ پہنچایا گیا تھا۔ بیگم کے پاس زیور کی ایک تار بھی نہ تھی۔ جسے بیچ کر جُرمانہ کی رقم ادا کر دیتی اور پچاس روپے مزید دیکر مرزا کو مشقت سے بچالیتی۔

گھر میں مرزا کی کمائی کی پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ کل اثاثہ پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ کرائے کے مکان میں رہائش تھی۔

دلی میں مرزا کے مداح خواہوں نے ایک روز بیٹھ کر مشورہ کیا کہ باہم چندہ جمع کر کے یہ ڈھائی سو روپیہ کی رقم سرکاری خزانہ میں جمع کرادی جائے کم از کم مشقت تو معاف ہو جائے گی۔ ورنہ مرزا کی جان زار اس مصیبت کی متحمل نہ ہو سکے گی۔ چنانچہ بعض مخلصین کی اعانت سے جُرمانہ کی مکمل رقم ادا کر دی گئی۔ لیکن سزا بحال رہی۔ اور مرزا صاحب قید خانے میں بند رہے اب مرزا صاحب کو الہی جان کے مرنے کا خیال ہوا۔ سینے کا زخم پھر تازہ ہو گیا۔ اس کی وفا یاد آئی مرزا نے سوچا یہ عذاب اسی بے تقصیر کی آہِ نارسا کا صدقہ ہے۔ چلو اچھا ہوا اگر یوں اس کی رُوح خوش ہو جائے تو سودا خسارے کا

نہیں ہے مرزا صاحب اکثر اپنے دوستوں سے الہٰی جان کا ذکر کرنے لگے۔ اور اظہار ندامت و افسوس کرتے اور کہتے ہم نے ابھی ایک غریب ڈومنی کو مار رکھا ہے۔ شاید اُسی کی سزا ملی ہے۔"

اگرچہ مرزا صاحب نے اس قید کے زمانے میں بہت ضبط و تحمل سے کام لیا۔ لیکن بے آبروئی کے صدمہ پر کسی کا بس نہ تھا۔ بیگم کی تنہائی کا غم بھی مار رہا تھا۔ رام کلی کا خیال بھی تڑپا رہا تھا۔ جب جیلر کو معلوم ہوا کہ یہ وہی مرزا صاحب ہیں جو مرزا غالب کے نام سے قلعہ معلی تک مشہور ہیں تو اس نے مرزا سے مدارات روا رکھی۔ اور سہولت دیدی کہ مرزا صاحب کے لئے ان کے گھر سے کھانا آسکتا ہے اور لباس بھی اپنا پہن سکتے ہیں۔ اس جیلر نے انہیں عام اخلاقی قیدیوں سے الگ کے ایک کمرہ میں رکھ لیا تھا۔ مرزا نے اس قید خانے میں فارسی میں چوراسی شعر کی ایک نظم لکھی تھی۔ جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

شادم از قید کہ از بندِ معاش آزادم
از کفِ شحنہ رسد جامہ و نالم زدہ بند

بعد میں مرزا صاحب نے یہ نظم اپنے فارسی ایوان سبد چین میں شامل کرلی تھی۔ مرزا صاحب نے اُردو میں بھی اس زمانہ کی یاد میں کچھ شعر کہے تھے ؎

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ میری زنجیر کا

لوہارو خاندان کی بے رخی نے رنجیدہ خاطر کیا اور کہا ؎

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل
دیکھکر طرزِ تپاکِ اہلِ دُنیا جل گیا!!

★

نہ لڑ ناصح سے غالبؔ کیا ہوا گر اُس نے شرارت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے۔ گریباں پر

★

ہوسِ گل کا تصوّر میں بھی کھٹکا نہ رہا
عجب آرام دیا ہے بے پروبالی نے مجھے

★

نے تیر کماں میں نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

★

اس مہربان جیلر کی مہربانیوں سے مرزا کے دوست اور عزیز و اقارب کو مرزا سے ملنے کی عام اجازت تھی۔ چنانچہ نواب شیفتہؔ اور مولینا آزردہؔ جب ان سے ملنے گئے تو وہ مرزا کو دیکھکر اور مرزا انہیں دیکھکر آبدیدہ ہو گئے۔ آواز گلے میں اٹک گئی۔ اشک بہہ گئے۔ دوستوں نے مرزا سے ان کا حال پوچھا۔ تو مرزا نے کہا ؎

؎

جس دن سے کہ ہم خستہ گرفتارِ بلا ہیں!!
کپڑوں میں جوئیں بخیئے کے ٹانکوں سے سوا ہیں

★

مرزا کے بعد بیگم اور گھر بار کی دیکھ بھال نواب شیفتہ نے اپنے ذمہ لے لی تھی۔ ورنہ مرزا کے رشتہ دار صاف لفظوں میں کہتے تھے کہ صاحبِ خال کی رقم پر تو مرزا کی بسراوقات تھی۔ ان تمام اقارب نے مرزا سے میل ملاپ ترک کر دیا۔ بلکہ شرابی جوئے باز مشہور کرنے لگے دشمن چاہتے تھے کہ مرزا حکام کی نظروں میں ذلیل ہو جائیں۔

اس بے مہری و کج ادائی کے سبب امراؤ بیگم نے بہت سے قریبی رشتہ داروں سے میل ملت ترک کر دی۔ مرزا قید میں تھے۔ عید الفطر کا چاند نمودار ہوا۔ بیگم کا صدمہ تازہ ہوا۔ لیکن شیفتہ نے اپنے بال بچوں کو امراؤ بیگم کے ہاں بھیجا۔ تاکہ اس کی دلداری کریں۔ لیکن بیگم شیفتہ کی غمگساری کے باوجود بیگم نے سارا دن رو رو کر گذارا۔ نواب شیفتہ نے حکام سے رابطہ پیدا کیا اور مرزا کی قید کی معیاد میں تین ماہ کم کروا لیے اور آخر کار ستمبر ۱۸۴۷ء میں شیفتہ کی سعی و سفارش

سے مرزا کو قید سے رہائی نصیب ہوئی۔ مرزا گھر آئے بیگم نے نفل پڑھے۔ سجدے کیئے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ احباب نے مبارک باد دی۔ مرزا نے رسوائی کے باعث گھر سے باہر نکلنا بالکل بند کر دیا۔ دوست احباب آتے اور دیوان خانے میں بزم آرائی ہو جاتی۔ یا صبح و شام بیگم کے پاس بیٹھے لطیفے کہا کرتے۔ لیکن بیگم کی سنجیدہ مزاجی کو یہ بذلہ سنجی پسند نہ آئی۔ دن یونہی گذرتے چلے گئے۔

اب تو آرام سے گذرتی ہے

۱۸۵۰ء کا زمانہ آگیا۔ مرزا غالب کا تعلق قلعہ معلےٰ سے ہو چکا ہے۔ بادشاہ ظفر کے استاذ ہو چکے ہیں۔ کئی شہزادے شاگردی میں آچکے ہیں۔ اپنے اپنے کلام کی اصلاح لیتے ہیں۔ اور مرزا کی خدمت کرتے ہیں۔

شہزادے شاعری کیا کرتے ہوں گے۔ تک بندی سے دل بہلا لیتے ہوں گے۔ مرزا صاحب کو ان کی شاعری سے کیا غرض ہوگی۔ اپنی خدمت مقصود ہوگی۔ شہزادگان کو اپنے ساتھ لگائے رکھنے کا مقصد اپنی بسر اوقات تھی۔ ایسا بھی ہوتا ہوگا کہ مشاعروں میں شہزادوں کی فرمائش پر کئی کئی غزلیں لکھ دیتے ہوں گے اور وہ اپنے نام سے پڑھ کر پھولے نہ سماتے ہوں گے۔ بس یوں سمجھو کہ حضرت غالب غزل فروشی سے گھر کے اخراجات پورے کرتے ہوں گے۔" حضرت شیخ نصیر الدین کو مرزا سے بڑی عقیدت تھی ان سے دلی اُنس تھا۔ ان

کے علم وفضل کے عاشق تھے۔ شیخ صاحب عرف میاں کالے صاحبؒ نے مرزا پر بڑی شفقت کی اور انہیں اٹھا کر اپنے مکان واقع لال کنواں پر لے آئے۔ مرزا دوستوں سے کہتے تھے کہ بھئی ہم نے گورے کی قید سے رہائی پائی اور اب کالے کی قید میں رہتے ہیں۔"

میاں کالے صاحب اپنے وقت کے بہت اچھے بزرگ تھے بادشاہ بھی ان کی بیحد عزت کرتا تھا۔ اور بزرگ دین مانتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اور حکیم احسن اللہ خان نے بادشاہ سے کہہ کر مرزا کو دربار میں جگہ دلوائی۔ قلعہ معلیٰ سے نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کا خطاب ملا۔ پچاس روپے ماہوار تنخواہ مقرر ہوگئی اور بادشاہ کی طرف سے دودمانِ تیموریہ کی تاریخ فارسی زبان میں لکھنے پر مامور ہوئے۔

امراؤ بیگم نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ گھر میں چار پیسے آنے لگے ہیں۔ بیگم نے مرزا سے کہا۔ شکر ہے خدا کا ہمارے بھی دن پھرے ہیں۔ مرزا نے کہا۔ دن تو کیا پھرے ہیں۔ دماغ ضرور پھر گیا ہے ؎

بیگم نے کہا۔ اے توبہ اللہ معاف کرے یہ کیا فرما رہے ہیں آپ دماغ پھرے دشمنوں کا۔"

مرزا نے بیگم کی طرف ہنس کر دیکھا اور پھر سرد آہ بھر کر کہا۔

میرا حال سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا۔ انسان کثرت غم سے دماغی توازن کھو بیٹھتے ہیں۔ سودائی ہوجاتے ہیں۔ عقل جواب دے

جاتی ہے۔ اگر شدتِ غم سے میری قوتِ متفکرہ میں فرق آ گیا ہے تو حیرت کی کیا بات ہے۔ کوئی مجھ سے پوچھے کہ کیا کیا غم ہیں:
غمِ عزت، غمِ روزگار، غمِ افلاس، غمِ دنیا، غمِ مرگ اور غمِ فراق؛
اس آخری لفظ پر بیگم کی ہنسی چھوٹ گئی وہ بیحد سنجیدہ مزاج عورت بھی طنز و مزاح سے باز نہ رہی اس نے ہنسی ضبط کرتے کرتے کہا۔ واہ خوب کوئی ابھی تک غمِ فراق میں مبتلا ہے۔ ہم سمجھے تھے کہ حضرت آخری عمر میں ہی مسلمان ہو جائیں گے۔ لیکن جناب مومن نے ٹھیک کہا ہے۔

ع
عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومن
آخری عمر میں کیا خاک مسلماں ہونگے

★

مرزا صاحب بیگم کا یہ طعن سُنکر گھبرائے بات بنانے کی فکر میں ذہن کو نچایا اور بولے۔

ہم نے جو شعر کہا ہے ؎
سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

★

ہمارا یہ شعر اپنے دوست احباب کے غمِ فراق کی غمازی کرتا ہے۔ بیگم نے پھر چٹکی بھری اور کہا دوست احباب تو اللہ رکھے سب

سلامت ہیں ایک وہ ڈومنی اس دُنیا سے اُٹھ چکی ہے۔ اُس کا تو ہمیں بھی غم ہے۔ جان دیدی تھی بیچاری نے۔ خدا کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے۔ مرگئی پر وفا پر داغ نہ آنے دیا۔ بیگم چوٹ پر چوٹ کئے جارہی تھیں۔ اور مرزا ندامت سے پریشان تھے۔

بات بنا رہے تھے پر بنتی نہیں تھی۔ بولے۔ اے بھئی یادش بخیر اس سے کچھ دوستوں کا ذکر مقصود ہے۔ نواب مصطفیٰ خاں صاحب کو ہی لے لیجیے کم احسان ہیں ان کے؟ بیگم نے پھر تردید کرتے ہوئے کہا۔ ان کی مہربانیوں سے کسے انکار ہے۔ لیکن وہ تو شب و روز ہماری محفلوں میں رہتے ہیں۔ آپ نے ذکر غمِ فراق کا کیا ہے۔ میں کہتی ہوں اب آپ نماز روزہ کی فکر کریں۔ اللہ تعالےٰ اپنے عبادت گذار بندوں کی خود فکر کرتا ہے۔

اب مرزا کو موقع ملا جھوٹ فقرہ چُست کیا اور کہا۔ یہ حقیقت آج عیاں ہوئی کہ اللہ میاں اپنے عبادت گذار بندوں کی فکر کرتے ہیں۔ بندیوں کی مطلق پرواہ نہیں کرتے۔ یہ کہکر مرزا خوب ہنسے۔ گویا بیگم کے طعن کا بدلہ لینا چاہتے تھے۔ سو لے لیا۔ اور پھر مسکرا کر کہا۔ بیگم تم نے اپنے اللہ میاں کو بھی بہادر شاہ ظفر سمجھ لیا ہے۔ کہ جس قدر اس کی خوشامد میں ظاہرداری برتیں گے اللہ میاں اتنا ہی خیال خاطر کریں گے۔ ہمارے نزدیک اُس پاک بے نیاز سے دلوں اور نیتوں کا معاملہ ہوتا ہے۔ بیگم نے کہا۔ اے واہ۔ اللہ میاں خوشامد سے خوش

کیوں نہیں ہوتے۔ دُنیا کے درباروں میں وہ کونسا دربار ہے۔ جس کے اہلِ کار خوشامد پر خوش نہیں ہوتے اس کا دربار تو دربارِ اعظم و اکبر ہے۔ وہ تو سب شہنشاہوں کا شہنشاہ ہے۔ جس زمانے میں خشک سالی ہوتی ہے۔ تو بستی کے لوگ مِل کر اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ اُس کے حضور گڑگڑا کر ہاتھ پھیلا کر رحمت کی دعائیں مانگتے ہیں۔ صدقہ و خیرات کرتے ہیں۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ بارانِ رحمت جوش میں آجاتی ہے۔ واقعی بارش ہو جاتی ہے۔ یہ سُن کر مرزا کی ہنسی چھوٹ گئی اور بولے۔ بیگم تم نے اپنے اللہ میاں کے متعلق خوب تصوّر قائم کر رکھا ہے۔ بڑے خوشامدی اور نعوذ باللہ رشوت خور ہیں۔ یعنی ہندؤں کے دیوتاؤں کی طرح بَلی دان لئے بغیر نہیں ٹلتے۔ توبہ کرو بیگم ہم خداوند تعالیٰ کو قانون والا خدا مانتے ہیں۔ ہم خدا کے بارے میں موجی خدا کا تصوّر نہیں رکھتے کہ موج میں آجائے تو قطرے کو دریا کر دے۔ رحمت پر آئے تو گنہہ گاروں کو بخش دے اور عذاب پر اُتر آئے تو راہ جاتے بیگناہوں پر قیامت ڈھا دے۔ شاہوں کو پَل بھر میں کنگال کر دے اور کنگلوں کو بادشاہ کر دے۔

نہیں بیگم اللہ میاں کے دربار میں ہر بات ضابطہ اور قانون کے مطابق ہوتی ہے۔ پھر تو امیر رئیس دولت خرچ کر کے اللہ میاں کو خوش کر کے اپنی بات منوالیں اور غریب مسکین ہر نعمت کو ترستے رہ جائیں۔

بیگم نے کہا۔ ہم آپ ایسے فلسفی سے جیت نہیں سکتیں۔ آپ ہیں عقل و فکر کے یہ جوہر نہ ہوں۔ تو لوگ اسد اللہ خاں کو غالب کیونکر کہیں مرزا نے ہنس کر کہا۔ آپ کا مقدمہ خارج ہوا آپ نے ہمیں غالب مان لیا ہے۔ ہمیں دین سے شغف ہے۔ مذہب سے لگاؤ نہیں۔ ہم غیر اسلامی باتوں کو گناہ۔ شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتے ہیں۔ اگر فرشتے ہمیں دوزخ میں ڈالیں گے تو ہم ناراض نہ ہوں گے۔ بلکہ خوش ہوں گے کہ ہم دوزخ کا ایندھن بنے اور دوزخ کی آگ کے تیز ہونے کا موجب ہوئے تاکہ مشرکین۔ اسلام اور منکرین نبوت مصطفیٰ اور امامت مرتضوی اس میں جلیں۔ بیگم نے انگشت بدنداں ہو کر کہا۔ آپ تو عالم دین نظر آتے ہیں یہ باتیں تو حضرت واعظ کے سوا کسی نے نہ سنی تھیں۔ مرزا نے کہا۔ خیر گذری ہمیں ایک گواہ مل گیا کہ ہم راسخ الاعتقاد مسلمان ہیں اور اہل بیت کی محبت سے سرشار ہیں۔ ورنہ ہماری بیوی اپنے شوہر کے متعلق یہی جانتی تھی کہ وہ بے دین۔ شراب خور، اور آزاد منش ہے۔ بخدا بیگم ہم بزرگانِ چشتیہ نظامیہ و قادریہ سے خاص عقیدت رکھتے ہیں۔ تم جانتی ہو کہ حضرت غوث علی شاہ اور حضرت کالے صاحب ہمارے مداح اور قدر دان ہیں۔

بیگم اور مرزا صاحب یہ باتیں کر رہے تھے کہ بی وفادار ن آئی اور بیگم کے سامنے موتیا کے پھول بکھیر کر بولی۔ لے لو بیگم صاحبہ یہ ہمارے بھتیجے کی کمائی کے ہیں۔ مرزا صاحب نے خادمہ کو دیکھا اور بولے

بڑی بی۔ تم نے بھٹیارن کی زبان کہاں سے سیکھ لی ہے۔ ہمارے کو ہمرے اور کیا زی کو کائی بولتی ہو۔"

بڑی بی نے عرض کیا۔ حضور یہ دلی ہے آگرہ نہیں اور باندی مغلوب ہے۔ غالب نہیں۔ یہ کہکر وہ ایک طرف کو چلی گئی۔

اتنے میں ڈاک کا ہرکارہ آیا اور ڈاک دے گیا۔ مرزا نے وہیں بیگم کے پاس بیٹھے ڈاک پڑھنا شروع کی۔"

لفافہ چاک کیا۔ پڑھا اور تاسف کیا کہا۔ ہائے ہائے۔ بیچارے کی دوسری بیوی بھی مر گئی ہے۔

بیگم نے پوچھا۔ کس کا خط ہے۔ کس کی بیوی دوسری مر گئی ہے؟

مرزا نے کہا۔ امراؤ سنگھ کا خط ہے لکھتا ہے۔

ننھے ننھے بچے ہیں اب اگر تیسری شادی نہ کروں تو کیا کروں اس کے سوا اور چارہ ہی کیا ہے۔ معصوم بچوں کی پرورش کیونکر ہو گی امراؤ سنگھ مجھ سے پوچھتے ہو تو میں کہوں گا مجھے تمہارے لئے رحم اور اپنے لئے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دو دو بار اُن کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں۔ ایک ہم ہیں کہ پچاس برس سے اُوپر سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے نہ تو پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے۔ امراؤ سنگھ میری مانو تمہارے بچوں کو میں پال لوں گا۔ خدا را کسی بلا میں نہ پھنسو۔"

بیگم۔ اچھا جی میں آپ کے حق میں بلا ہوں۔

مرزا۔ ایں۔ کیا آپ سُن رہی ہیں۔

بیگم۔ جی نہیں۔ مجھے تو بہرہ ہونا چاہئے۔

مرزا۔ اے خدا نہ کرے پھر میری کون سُنے گا۔

بیگم۔ ہیں تو آپ کے گلے میں پھانسی کا پھندا ہوں۔ جو نہ ٹوٹتا ہے۔ نہ زم ہی نکلتا ہے۔ ایسا ہی ہے تو زہر دیدیں۔ آپ کی خوشی پوری ہو جائے۔ گلے کا پڑا پھندا ٹوٹ جائے "۔

مرزا۔ (ہنس کر) میں سمجھا کہ آپ نماز میں مشغول ہیں۔

بیگم۔ نماز میں کان بند نہیں ہو جاتے۔

مرزا۔ ہم تو یہی سمجھتے تھے کہ خدا کی عبادت میں دھیان بند ہو جاتا ہے۔

بیگم۔ کچھ اور کہہ لیجئے۔

مرزا۔ یہ تو دل لگی تھی ورنہ۔ ع

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ

بیگم۔ شام سے صبح ہو گئی زندگی کنارے آن لگی ہے۔ میں نے کبھی کچھ کہا ہے؟

مرزا۔ جی نہیں۔ صرف ہمارے برتن الگ کر رکھے ہیں۔

بیگم۔ نفرت سے نہیں شراب کی وجہ سے۔ اور وہ بھی آپ کے برتن نہیں اپنے برتن الگ کر رکھے ہیں۔

مرزا۔ بیگم آپ کی مہربانیوں کا جواب نہیں۔ سچ پوچھو تو اب

تک ہمارے جینے کا راز یہی ہے کہ تم نے ہمارا ساتھ دے رکھا ہے۔ ورنہ اپنا خیال تو یہ ہے ؎

زندگی اپنی جو اس رنگ سے گذری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

★

بیگم۔ پھر وہی خدا کی جناب میں بے ادبی۔

مرزا۔ بے ادبی نہیں۔ شکوہ ہے۔ تم اللہ میاں کو غیر سمجھتی ہو۔ ہم اس سے بے تکلف ہیں۔ تکلیف ہو گی تو تکلیف کی شکایت کریں گے۔"

بیگم۔ توبہ توبہ اللہ میاں سے دل لگی ؛ انہی باتوں پر تو لوگ آپ کو دہریہ کہتے ہیں۔

مرزا۔ اے بھئی بیگم ہماری بات کا بُرا نہ ماننا ؎

بک گیا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ!
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

★

قریب ہی میاں مٹھو کا پنجرہ پڑا تھا اور میاں مٹھو خاموش بیٹھا تھا۔ مرزا نے کہا۔ کیوں میاں مٹھو نہ تمہارے جورو نہ بچے۔ تم کس فکر میں سر جھکائے بیٹھے ہو۔

بیگم۔ ہاں میاں مٹھو۔ تمہارے مرزا صاحب تو جورو بچوں کی فکر

میں گھلے جا رہے ہیں۔ یہی وبالِ جان لمبا بنا ہوا ہے ؎

مرزا۔ بھئی انہی باتوں سے تو ہم تمہیں حضرت موسیٰ کی بہن کہتے ہیں۔

بیگم۔ بس چپ رہئے۔ ہو لیا۔ آپ کو میری بات ماننی پڑے گی۔

مرزا۔ ارشاد۔

بیگم۔ یہ بدبودار عرق پینا چھوڑ دیں۔

مرزا۔ ؎

مئے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اِک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

★

بیگم۔ بس ساری پریشانیاں اسی بدبخت کی وجہ سے ہیں۔

مرزا۔ لیکن اپنا تو عقیدہ ہے ؎

بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے
غلامِ ساقیِ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

★

بیگم۔ یہ سب شاعری ہے اور کچھ نہیں۔

مرزا۔ چلو شاعری ہی سہی۔ اب تو آپ اپنا تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلّت سے خوش ہوتا ہوں۔ یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچا ہے۔ کہتا ہوں کہ لو غالب

کے ایک۔ اور جوتی لگی بہت اتراتا تھا کہ میں یکتائے زماں ہوں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں۔ اے شاعر خوش نوا ذرا قرض داروں کو جواب دے۔ یہ غالب اپنے تئیں شہنشاہ قلمرو سخن جانتا تھا۔ لے نجم الدولہ دبیر الملک ایک قرض دار کو تمہارے گریبان میں ہاتھ ہے دوسرا جو منہ میں آتا ہے سنا رہا ہے۔ کوئی پوچھے کہ اس سلجوقی و افراسیابی کی یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے۔ ایک خاندان پر اترانے والا کیا۔ بے غیرت بن گیا ہے۔ کوٹھی سے شراب گندھی سے گلاب بزاز سے کپڑا میوہ فروش سے آم۔ صراف سے دام قرض لئے جا رہا ہے سوچتا نہیں کہ دیگا کہاں سے!

بیگم۔ بس چپ رہو جی۔ گھر میں بہو رانی ہے (زین العابدین کی بیوی) سن لے تو کیا کہے۔ اب تو کچھ شرمایا کرو۔ اتفاق سے بہو ادھر آنکلی۔ مرزا کو شرارت سوجھی بولے۔ بھئی ہم میاں بیوی راز دارانہ باتیں کر رہے تھے۔ تم یہاں کیا کرنے آگئی ہو۔ دولہن یہ سنکر شرم سے پسینہ پسینہ ہو گئی اور کمرے میں بھاگ گئی۔" بیگم نے تڑپ کر کہا۔

اے لو غضب خدا کا۔ بڑھاپے میں دماغ تو نہیں چل گیا۔ مجھ سے تو دل لگی ہوتی تھی۔ اب بہو سے بھی مذاق سوجھا ہے۔ بیگم نے مرزا کی خوب لعن طعن کی غالب شرمندہ ہو گئے اور اٹھ کر چلے گئے۔

عمر بھر دیکھا کئے مرنے کی راہ

امراؤ بیگم اور مرزا غالب نے اپنے سات کمسن بچوں کا ماتم کرکے آخر کار امراؤ بیگم نے اپنی بہن بنیادی بیگم کے لڑکے زین العابدین کو گود لے لیا غالب نے بھی متبنیٰ بنا کر سینے سے لگا لیا۔ اس کی پرورش کی وہ جوان ہوا۔ اور نواب شمس الدین خاں کی بہن نواب بیگم سے اس کی شادی کر دی۔

زین العابدین نے شاعرانہ مزاج پایا تھا۔ اور عارف تخلص کرتے تھے۔ بڑے حسن پرست اور عاشق مزاج تھے۔ خود بھی خوبصورت اور خوش جمال تھے۔ بلکہ لاکھوں میں ایک تھے۔ نواب بیگم کو عارف کے مزاج نے قبول نہ کیا۔ اور اس کے نتیجے میں گھر کے ماحول میں جو بدمزگی پیدا ہونی چاہیے تھی سو ہوئی۔ امراؤ بیگم کو اس کا رنج تھا کہ گھر کے چراغ میں چمک دمک نظر نہیں آتی۔ بجھا بجھا سا رہتا ہے۔ مرزا کو قلق تھا کہ سیلاب بلا نے رُخ کیا تو پھر اسی گھر کا رُخ کیا۔

تھوڑے ہی عرصہ بعد عارف کی نظر ایک مہ جبیں پردہ نشین سے لڑ گئی۔ یہ مرزا محمد علی کی نوجوان دوشیزہ بستی بیگم تھی۔ بستی بیگم تندرست نازک پری چہرہ جوان حسینہ تھی۔ اس وقت عارف کے دو صاحبزادے تھے۔ چھوٹے لڑکے کا نام حسین علی خان تھا۔ اور بڑے کا باقر علی خان تھا۔
گویا غالب کے یہ دو پوتے تھے جو گھر کے ویرانے میں بہار کا باعث بن جاتے تھے۔ غالب انہیں بہت چاہتے تھے۔ ابھی دونوں کمسن تھے۔ یہ دونوں اپنے دادا ابا سے بیحد مانوس تھے اگر کبھی مرزا دہلی سے باہر جاتے تو یہ بھی ساتھ شریک سفر ہوتے۔ رام پور تو اکثر مرزا کے ساتھ جاتے رہتے تھے۔
عارف نے اپنی محبت کو چھپانے کی کوشش کی شروع شروع میں دل کو سمجھانے کی کوشش کی۔ اپنے خاندان پر نگاہ کی۔ بچوں کا خیال کیا۔ بیوی پر ترس کھایا۔ لیکن دل کو کسی پر رحم نہ آیا۔ اور عشق نے خوب ناچ نچایا۔"
عاشق بیٹے کو ماں نے بات سمجھائی۔ باپ نے راہ دکھائی لیکن حضرت عشق کی سمجھ میں کوئی بات نہ آئی۔ عارف دردِ محبت سے مجبور ہوئے۔ راحت و آرام سے دور ہوئے۔ بیگم کو ایک طرف بیٹے کا خیال تھا۔ دوسری طرف خاندان سے جھگڑا کا احتمال تھا۔ سوچتی تھی اور حیران تھی بیٹے کی حالت سے پریشان تھی۔
ایک دن بیگم نے مرزا سے مشورہ کیا اور پوچھا۔

بیگم۔ کیوں جی میں پوچھتی ہوں عارف کا کیا ہوگا۔
مرزا۔ وہی ہوگا جو منظورِ خدا ہوگا۔
بیگم۔ توبہ ہے۔ کبھی تو سنجیدگی سے بات سن لیا کریں۔ ہر موقعہ دل لگی بے معنی ہوتی ہے۔
مرزا۔ بات دل لگی کی نہیں ہے۔ بیگم دل کی لگی کی ہے۔
بیگم۔ پھر کچھ سوچئے۔ معاملہ بڑا نازک ہے۔ اس کا کوئی علاج سوچئے۔
مرزا۔ عارف مریض عشق ہے۔ اسے عشق کا مرض ہے۔ جس کا علاج کسی معالج کے پاس نہیں ہے۔
بیگم۔ پھر کیا کیا جائے؟
مرزا۔ بُرا نہ مانو تو کہہ دوں۔ وہ کرو جو ہمارے حق میں نہ کیا جاسکا۔
بیگم۔ اُف توبہ، ابھی تک اپنا خیال پلے باندھ کر رکھا ہے۔ بیٹے کو خُدا کے رحم و کرم پر چھوڑ دیئے۔ پہلے اپنا علاج کر لیجئے۔ لے آیئے اس رام کلی کو۔ بُلا لیجئے اس خورشید جان کو۔ اور خُدا سے مانگئے۔ "لیجیئے الٰہی کو۔"
مرزا۔ بیگم! تم نے تو طعن دینے شروع کر دیئے۔
بیگم۔ جی نہیں۔ میں نے تو آپ کے مرضِ کہنہ کا علاج بتایا ہے۔
مرزا۔ اے لقمان حکیم کی بہن آپ کا نسخہ ضامنِ شفا ہے۔ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ عارف کی شادی محمد علی کی صاحبزادی سے کر دو۔ نواب بیگم پر سوت لے آؤ۔

بیگم۔ شمس الدین خاں سے تو ہمارے پہلے سے ہی تعلقات غیر خوشگوار ہیں۔ پہلے ہی ان سے کون سی یگانگت ہے۔

مرزا۔ رشتہ داری کا لحاظ ہے تو عارف سے کہہ دیں کہ اپنے باپ کے نقش قدم پر چلے۔ دل سے ہاتھ دھو لے۔

بیگم۔ بات کسی کی ہو آپ اپنی بات ضرور کھینچ تان کر درمیان میں لے آیا کریں۔ بڑھاپے میں جوانی کی مستیاں یاد آتی ہیں۔

مرزا۔ مانا عارف کی رگوں میں ہمارا خون نہیں ہے تربیت تو ہماری پائی ہے۔ پھر جس کام کو باپ نے ادھورا رکھا ہے اُسے بیٹا مکمل کیوں نہ کر دے۔

بیگم۔ کیا خوب۔ بیٹے کے دشمنوں کی جان پر بنی ہے۔ اور حضور اپنے عشق کی کہانیاں دہرا رہے ہیں۔

مرزا۔ اچھا صاحب غلطی ہوئی۔

بیگم۔ میں نے آپ سے مشورہ لیا ہے۔ اور آپ بات کو باتوں میں اُڑا رہے ہیں۔ سوچتی ہوں کہ نواب بیگم کے میکے سے ہماری کون سی بنی ہوئی ہے۔ جو عارف کی دوسری شادی کی وجہ سے بگڑ جائے گی۔ بھاڑ میں جائے یہ رشتہ داری ہمیں تو اپنا اکلوتا بیٹا عزیز ہے۔ کہیں تو محمد علی کے ہاں پیغام بھیجکر دیکھوں۔

مرزا۔ ہمیں یہ بات کچھ پسند نہیں۔ شمس الدین خاں سے ہماری دشمنی تھی۔ لیکن نواب بیگم کو بہو بنا کر لے آنے سے وہ سب دفن ہو

گئی۔ اگر کچھ ہے بھی تو بیچاری بہن دشمنی کا بدلہ کیوں پائے۔ ہمارے دل سے پوچھو تو ہم عارف کے نکاح ثانی پر آمادہ نہیں ہیں۔"

بیگم۔ دل میرا بھی یہی صلاح گیر ہے۔ لیکن کوئی دوسری راہ بھی تو نظر نہیں آتی۔ عارف بستی بیگم کی محبت میں بُری طرح سے بیتاب ہے۔ اب تو وہ پگلا بستر پر پڑ گیا ہے۔ مجھے تو ہول آتا ہے اسے پریشان حال دیکھکر دُنیا کی کوئی شے اچھی نہیں لگتی۔ میں بیٹے کی تمنا پوری کرنے کی خاطر سب کچھ گوارا کر سکتی ہوں۔

مرزا۔ کیا تم پہلی بہو کے سُکھ چین کو بھی قربان کر دو گی۔

بیگم۔ ہاں جب میں اپنی جان تک قربان کرنے کو تیار ہوں تو دوسرے کی جان کا دریغ کیوں کروں۔

مرزا۔ شاید تم اپنا وقت بھول گئی ہو۔ آگرہ سے دہلی آنیکا سبب یاد ہے تمہیں۔؟

بیگم۔ اب میں ماں ہوں مجھے اپنا نہیں اپنے بیٹے کا خیال ہے۔

مرزا۔ اس وقت بھی کسی ماں کو اپنے بیٹے کے ارمانوں کا خیال گذر سکتا تھا۔

بیگم۔ آپ تو جھگڑا چاہتے ہیں۔

مرزا۔ نہیں معاملہ کی نزاکت پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔

بیگم۔ آپ کی بات مان لی۔ لیکن شمس الدین خاں کی بہن کے سُکھ سے ہمیں کیا سُکھ مل سکتا ہے۔ اگر جوان بیٹے کو کچھ ہو گیا تو ہماری

دنیا اندھیر ہو جائے گی زن و شوہر کے تعلقات پہلے کون سے خوشگوار ہیں۔ میں نے تو عارف کے لب پر آج تک تبسم نہ دیکھا۔

مرزا۔ ہم نے نامراد رہ کر کیا پھل پایا ہے۔ جو بیٹے کی انگلی پکڑ کر اس راہ پر لے چلیں۔ ٹھیک ہے بیگم تمہارا خیال ٹھیک ہے۔ ہم بیٹے کو نامراد کرنا گوارا نہ کریں گے۔ البتہ تم اپنی بہن بنیادی بیگم اور ان کے شوہر غلام حسین خان سرور سے بھی بات چیت کر لو۔ آخر وہ عارف کے ماں باپ ہیں۔"

بیگم۔ ان کے مابین کونسا خوشگوار رشتہ قائم ہے۔ شوہر نے بیوی سے قطع تعلق کر کے سات ہزار سالانہ کی جائداد لکھ رکھی ہے۔ اور خود دادِ عیش دے رہے ہیں۔ وہ کیا اقرار کریں گے اور کیا انکار۔ بنیادی بیگم میری بہن ہے۔ عارف اب میرا بیٹا ہے وہ میری مرضی کے خلاف نہیں جا سکتی۔ رہا سرور صاحب کا سوال۔ انہیں گھر کے معاملات سے کوئی لگاؤ ہی نہیں۔

مرزا۔ تو پھر محمد علی کے ہاں جا کر دیکھ لو۔

دو چار روز کی گفت و شنید کے بعد بستی بیگم عارف کی نئی دولہن بن کر غالب کے گھر آ گئیں۔ اس نے نواب دلہن کا خطاب پایا۔ محبت کے نئے چاؤ چوچلے ہونے لگے۔ عارف شادماں نظر آنے لگا۔ بیگم اور مرزا نے بھی خوشی کا منہ دیکھا۔ گھر میں رونق کی چہل پہل ہوئی۔ عارف اس پر جان نچھاور کرتے تھے۔ نواب بیگم اپنے میاں پر

قربان ہو ہو جاتی تھی۔ گھر کی ویران بستی بزم چراغاں بن گئی۔ لیکن چرخ نیلی فام کو منظور نہ تھا کہ مرزا غالب کسی بہانے خوشی کے چار روز نہ دیکھ لیں۔ اس ستمگر نے موت کی کمان میں تیر باندھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے نواب بیگم کو دردِ گردہ نے دبوچ لیا اور اس نے دم توڑ دیا۔ اس کی اچانک موت نے عارف کو بسترِ مرگ پر ڈال دیا۔ اور مرحومہ کے ہفتہ عشرہ بعد اس کی روح بھی نواب بیگم کی روح سے جا ملی۔ ۱۸ اپریل ۱۸۵۲ء کا دن مرزا کی زندگی میں قیامت کا دن تھا۔

ان کی زندگی جو پہلے ہی سراسر ماتم آرزو تھی اس نئے ماتم سے حشر ساماں نظر آنے لگی۔ در و دیوار پر غم و الم کے چھاپے لگے تھے۔ اندر باہر کہرام مچا ہوا تھا۔ بیگم اور مرزا بڑھاپے میں ایک نئے ستم سے ہمکنار ہوئے۔ جوان بیٹا مر گیا تھا۔ جوان بھی کون؟ جوانِ رعنا۔ خوش گفتار خوش ذوق خوش جمال خوبرو خوب صورت خوب سیرت، صاحبِ علم و ادب۔ صاحب اولاد۔ شاعرِ شیریں سخن۔ زین العابدین خاں عارف مر گیا تھا۔ غالب اپنے تمام رنج و الم بھول کر ایک نئی اذیت میں مبتلا ہوئے۔ غالب نے نوحہ کہا۔"

نوحہ

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

مٹ جائیگا سر گر تیرا پتھر نہ گھسے گا
ہوں در پہ تیرے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
مانا کہ ہمیشہ نہیں، اچھا، کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

تم ماہ شب چہار دہم تھے۔ مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر وہ نقشہ کوئی دن اور

تم کون سے ایسے تھے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

مجھ سے تمہیں نفرت سہی نیر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

گذری نہ بہرحال یہ مدت خوش و ناخوش
کرنا تھا جواں مرگ، گزارا کوئی دن اور
ناداں ہو جو کہتے ہو کیوں جیتے ہو غالبؔ
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

آگ اس گھر کو لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

مرزا غالب پر تاریخ کا الزام ہے کہ وہ ساری عمر حکمرانوں کے قصیدہ گو رہے۔ بالخصوص انگریزوں کی خوشامد اُن کا شیوہ شب و روز تھا۔ مرزا نے اس کا خود اقرار کیا ہے ؎

خانہ زاد اور مُرید اور مدّاح
تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار

تاریخ کو مرزا سے یہ بھی شکایت ہے کہ انہوں نے بادشاہوں اور حکمران لوگوں کی دہلیز کو درِ قاضی الحاجات تسلیم کر رکھا تھا۔ ان اَن داتاؤں کے نیاز مند تھے اور خدا سے بے نیاز نہ تھے چنانچہ اپنے قلم سے یہاں تک لکھ گئے ؎

بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ
کعبۂ امن و اماں کا در کھلا

☆

غالب ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے گویا ان کی پیدائش سے

چالیس برس قبل انگریزوں نے نواب سراج الدولہ کو پلاسی کے میدان میں شکست فاش دیکر ۱۷۵۷ء میں مضبوطی سے قدم جمالئے تھے۔ مرزا صاحب اس واقعہ سے ۵۳ برس بعد جب ۱۸۱۰ء میں آگرہ چھوڑ کر دہلی پہونچے تو مغلیہ سلطنت کا آخری چراغ بھی ٹمٹما رہا تھا۔ لال قلعہ میں بہادر شاہ ظفر کی نام کی حکومت تھی۔ جو صرف قلعہ معلیٰ کی چار دیواری میں مقید و محدود تھی۔ اگرچہ اپنی پریشانی خاطر دور کرنے کی خاطر مرزا نے دربار ظفر تک بھی رسائی کی جبہ سائی کی۔ لیکن زیادہ تر ملکہ وکٹوریہ کی حکومت کے مدح سرا رہے۔ حقیقت یہی ہے کہ اس کے سوا چارہ کار بھی کوئی اور نہ تھا۔ مرزا لڑکپن ہی سے عیاش طبع واقع ہوئے تھے آبا و اجداد کی وراثت ان محفلوں میں اجاڑ کر دلی چلے جانے پر مجبور ہوئے تھے اور سسرال کے ٹکڑوں پر بسر اوقات تھی۔ شعر و ادب ہی ایک ہنر تھا۔ جسے مرزا ذریعہ معاش بنا سکتے تھے۔ چنانچہ شاعری کو مدح گستری کے رنگ میں ڈھال کر قصائد کا پیراہن پہنا کر عروس سخن کو درباروں میں پیش کیا۔

جب مرزا کی شاعری ذریعہ معاش بن کر رہ گئی تو نہایت دل گداز ہو کر اپنی صلاحیتوں پر ماتم کرتے ہوئے کہا۔

ع۔ کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے

آخری عمر میں تو مرزا بالکل سخن فروش ہو کر رہ گئے تھے۔ قلعہ معلیٰ میں شہزادگان کی شب و روز فرمائش پر غزلیں کہتے۔ اور ان

کے نام سے غزل کہہ کر انہیں خوش رکھنے کے سامان پیدا کرتے۔ وہ اس معاوضہ میں کچھ نقد نذر کر کے غالب کے خوش رکھنے کی کوشش کرتے۔ خود بادشاہ کو مشاعروں میں عزت دلوانے کے لئے اُس کے کلام کی اصلاح کے بہانے سے غزل کو مرصع و مرقع کر کے دیتے۔ بادشاہ داد پاتا۔ خوش ہوتا اور غالب کے گھر تحفہ کے انداز میں کچھ نہ کچھ بھجوا دیتا۔ یہی طور طریقے مرزا نے انگریز حکمرانوں کے ساتھ اختیار کر رکھے تھے۔ اسی علم و ادب کے صدقے میں ان سے مراسم بھی قائم تھے۔ کسی افسر سے دوستانہ راہ و رسم بھی تھی۔ مرزا ان کے مداح بھی تھے۔ خیر خواہ بھی تھے۔ زمانہ اسی انداز سے گذرتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ ۱۸۵۷ء کی ملک گیر تباہی نے سر اُٹھایا۔ اور غدر دہلی نے تاریخ میں نام پیدا کیا۔ تذکرہ بغاوت ہند سے قبل لازم آتا ہے کہ اس کے اسباب و علل پر بھرپور تاریخی روشنی ڈالی جائے اس لئے کہ۔

ع

بنتی نہیں ہے ساغر و مینا کہے بغیر

اسباب بغاوت ہند

۱۸۵۷ء سے قبل دہلی، آگرہ، میرٹھ، بجنور اور پنجاب میں انگریزی مشنریوں کے کاروبار وسیع پیمانے پر پھیلنے شروع ہو گئے۔ ان لوگوں کو دوسرے لفظوں میں مکتی فوج بھی کہا جاتا تھا۔ یہ مذہبی پرا پیگنڈہ پارٹی کے لوگ شہروں سے شروع ہوئے اور دیہاتوں تک پہونچ گئے۔ یہ لوگ صرف مسلمانوں سے مباحثے کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے جابجا مباحثوں کا جال پھیلا دیا۔ مباحثوں کی رُوح مذہبی عقائد ہوتے تھے۔ ان مشنری والوں کا نصب العین یہ تھا کہ مباحثوں کے ذریعے مسلمانوں کے مذہبی عقائد پر ضرب لگائی جائے۔ دین اسلام کو عیسائیت کے مقابلہ میں جھوٹا ثابت کیا جائے۔ قرآن مجید کو انجیل مقدس کے مقابلہ میں (نعوذ باللہ) جھوٹا ثابت کیا جائے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ثابت کیا جائے کہ وہ خدا کے بیٹے ہیں۔ اور خدا نے انہیں زندہ اپنی طرف اٹھا لیا ہوا ہے۔ لہذا اس شفقت و رتبہ کے لحاظ سے حضرت عیسیٰ ابن مریم حضرت محمد رسول اللہ سے اعلیٰ و اکبر ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان

مباحثوں کے نتائج بڑے تلخ نکل سکتے ہیں۔ چنانچہ جانبین میں ناپسندیدہ جھگڑے اُٹھتے رہے۔

تعصب۔ مخالفت اور دشمنی پیدا ہوئی۔ نفرت نے جنم لیا اور دوستوں کے دل بٹے ہوئے۔ یہ امر حقیقت ہے کہ سرکشی اس وقت جنم لیتی ہے جب لوگوں کی طبیعت۔ مزاج۔ طینت۔ ارادہ۔ عزم، رسم و رواج۔ خصلت۔ عادات اور مذہبی رسوم کے خلاف باتیں سامنے آئیں۔ چونکہ عیسائی مشنری نے ہندوستان میں مباحثوں کے ذریعہ اسی قسم کا مواد پیدا کیا تھا۔ للہذا نتیجہ کے طور پر یہ تمام برائیاں اُبھر کر سامنے آگئیں۔

۱۸۲۷ء میں جب لارڈ ہرسٹ صاحب بہادر نے اعلانیہ کہہ دیا کہ ہماری گورنمنٹ اب بالکل تیمور خاندان کے تابع نہیں ہے بلکہ وہ خود ہندوستان کی بادشاہ ہے تو قلعہ معلیٰ سے لیکر شہر کے گلی کوچوں تک اس کا اثر ہوا لیکن محکومیت کی وجہ سے کسی گوشے سے نفرت کی چنگاری نہ چمکی۔

برٹش گورنمنٹ نے ہندوستان میں لیجسلیٹو پارلیمنٹ قائم کی۔ اور اس پارلیمنٹ میں کسی ہندوستانی کی شمولیت کو گوارا نہ کیا گیا۔ چنانچہ ہندوستانی رعایا کے دلوں میں شکوک پیدا ہوئے کہ حکومت کوئی ایسے قوانین قواعد و ضوابط اور طور طریقے وضع کرنے والی ہے۔ جو ہندوستانیوں کے رسم و رواج اور مذہبی عقائد کے خلاف ہوں گے۔ اسی واسطے پارلیمنٹ میں کسی ہندوستانی کو شریک نہیں کیا

گیا کہ حکومت کے ارادے اور منصوبے نہ کھل جائیں۔ رعایا کو یقین ہو گیا کہ حکومت کی نیت اچھی نہیں ہے ہماری خواہشات کی ہرگز پرواہ نہیں ہے۔ اس بدگمانی نے رُوحِ بغاوت کو جنم دیا تھا۔ جو پانچ اصولوں پر مبنی تھی۔

اوّل۔ گورنمنٹ کی تجاویز کو اپنے خلاف سمجھا۔

دوم۔ ایسے قوانین کو جاری ہونا۔ جو ہندوستانیوں کی عادات کے خلاف تھے۔

سوم۔ رعایا کے حالات۔ مزاج اور عادات سے حکومت کا ناواقف رہنا۔

چہارم۔ حکومت کی طرف سے ان امور کو ترک کر دینا۔ جو ہندوستانیوں کے حق میں بہتر تھے۔

پنجم۔ فوج میں بدنظمی کا پھیل جانا اور حکومت کا ان کے شکوک رفع نہ کرنا۔

★

اسی زمانے میں عیسائی مشنریوں نے شہروں میں مشنری اسکول قائم کر دیئے اور کہا گیا کہ جو طالب علم ان اسکولوں سے فارغ التحصیل ہوں گے۔ انہیں سرکاری ملازمتیں مل جائیں گی۔ اس چمکتے ہوئے مفاد کے پیشِ نظر عوام نے اپنے بچوں کو ان مشنری اسکولوں میں داخل کر دیا۔ ان اسکولوں میں مذہبی تعلیم دی جانے لگی۔ امتحانوں میں پوچھا

جاتا تھا کہ تمہارا خدا کون ہے۔ اور تمہارا نجات دہندہ کون ہے اگر طالب علم نے جواب میں یسوع مسیح کا نام لے دیا تو اسے پاس کر دیا جاتا تھا۔ اور اُسے انعام بھی دیا جاتا۔ جب یہ باتیں طالب علموں کے والدین تک پہنچیں تو ذہنوں میں خلفشار پیدا ہوا۔ عوام کے دلوں میں حکومت کی طرف سے بد اعتمادی پیدا ہو گئی۔ آگے چل کر اس بیج سے ہی بغاوت کا پودا پھوٹا۔

عیسائی مشنری نے لڑکیوں کے لئے اسکول قائم کر دیئے اور ملک میں پرچار شروع کیا کہ لڑکیوں کو بھی تعلیم حاصل کرنی چاہئے کون شخص ہوگا جو اس سے متفق نہ ہوگا۔ لوگوں نے اپنی بچیوں کو بھی اسکول میں بھجوا دیا اور بعد میں ان کا بھی وہی حشر ہوا۔ جو لڑکوں کا ہو چکا تھا۔ اس پر پرانی وضع اور پرانے خیالات کی مذہب پرست عورتوں نے سخت نفرت کا اظہار کیا اور حکومت کی نیت پر بجا طور پر شک و شبہ کرنے لگیں۔

۱۸۱۹ء میں ضبط اراضی کا قانون نافذ ہوا جس سے تمام معافیات ضبط کر لی گئیں۔ اس سلوک نے رعایا کو سخت تکلیف پہنچائی۔ تنگ معاشی کی تکلیف سے لوگ بدظن اور دشمن ہو گئے"۔

لوگوں سے زندگی کا سکون چھین لیا گیا۔ زندگی کی سہولتیں ختم کر دی گئیں۔ راحت و آرام کے تمام دروازے بند کر دیئے گئے۔ آسائش و راحت کے سامان موقوف ہو گئے۔ ہر طرف مفلسی

تنگدستی، غریبی اور ناداری کا شور برپا ہوا۔ عوام کو حکومت سے نفرت ہو گئی۔

اودھ میں حکومت نے تعلقہ داری بندوبست ختم کر دیا۔ اس تعلقہ داری بندوبست کے ماتحت کچھ لوگوں کو جاگیریں عنایت ہوئی تھیں۔ ان جاگیروں کی وجہ سے وہ جاگیردار راجے مہاراجے اور نواب کہلاتے تھے۔ جب یہ بندوبست ختم ہوا اور تمام جاگیریں بحق گورنمنٹ ضبط ہوئیں۔ تو بڑے لوگوں کو فکرِ معاش نے آن گھیرا ان کی ٹھاٹھ کی زندگی افلاس میں تبدیل ہو گئی۔ ان کے ساتھ ہزاروں گھرانوں کو مفلسی کا شکار ہونا پڑا۔ چنانچہ یہ طبقہ بھی حکومت سے بدظن ہو گیا۔

جب باغی گروہ نے دیکھا کہ ہندوستان میں افلاس پوری طرح سے پھیل چکا ہے تو انہوں نے نوکریوں کے دروازے کھول دیئے بھوک سے تنگ آئے ہوئے اور افلاس کے ستائے ہوئے لوگ ان کی طرف بھاگے۔ انہیں ایک آنہ یا ڈیڑھ آنہ یومیہ یا سیر ڈیڑھ سیر اناج یومیہ پر نوکری دیدی گئی۔ یہ لوگ فکرِ معاش سے کسی قدر بے فکر ہوئے ان کی تمام ہمدردیاں ان نئے آقاؤں سے وابستہ ہو گئیں وہ کہتے تھے کہ ہم تو نوکر ہیں۔ جس کا کھائیں گے اُس کے گُن گائیں گے۔ اس طرح باغی گروہ کو بیحد تقویت مل گئی اور ان کی جماعت لاکھوں تک پہنچ گئی۔"

۱۸۵۷ء سے کچھ پہلے انگریزی حکومت نے مختلف عقائد اور مذہب وملت کے لوگوں کو ایک ہی پلٹن میں بھرتی کرلیا تھا۔ اور انہیں ایک ہی کیمپ میں رہنے کا حکم دیا گیا۔ اور یہ انتظام کیا گیا۔ کہ سب کو ایک ہی شخص کے ہاتھ سے پکا ہوا کھانا کھانا ہوگا۔ انگریزوں کا خیال تھا کہ اس سے یگانگت پیدا ہو جائے گی۔

جنوری ۱۸۵۷ء میں ہندوستانی سپاہیوں کو استعمال کے لئے کارتوس دیئے گئے ان کارتوسوں پر سور کی چربی کا خول چڑھا ہوا تھا۔ جسے دانتوں سے اتارنا پڑتا تھا۔ ہندو اور سکھ سپاہیوں نے مسلمان سپاہیوں کے مذہبی جذبات کو مشتعل کیا۔ چونکہ مسلمانوں کے نزدیک سور حرام ہے۔ اس لئے مسلمان سپاہیوں نے مشتعل ہو کر وہ کارتوس استعمال کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ خبر پنجاب سے میرٹھ آگرہ، دہلی اور بجنور اور لکھنؤ تک پہنچی۔ فوج میں سخت قسم کا ہیجان پیدا ہو گیا۔

اس میں شبہ نہیں کہ ہر قوم میں فسادی قسم کے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب بریلی سے فوج دہلی پہنچی تو بریلی والوں نے اپنی طرف سے فتوے چھاپ کر شائع کر دیئے اور علماء کی جعلی مہریں ثبت کر دی گئیں۔ اور فتوے میں اعلان کر دیا گیا کہ انگریزوں کے خلاف جہاد واجب اور جائز ہے۔ اس شرارت سے ہندوستان میں شورش اٹھی اور حکومت نے فیصلہ دیا کہ ہندوستان کے تمام

مسلمان اس سازش کے مرتکب ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اُس زمانے کے معزول بادشاہ کے پیچھے مسلمان علماء لوگ نماز پڑھنا جائز نہیں سمجھتے تھے۔ چہ جائیکہ معزول بادشاہ کی کسی قسم کی طرفداری میں مظاہرے کرتے۔ اُس زمانے میں مولوی محمد اسماعیل بڑے جید عالم بزرگ تھے۔ انھوں نے فتویٰ صادر کیا کہ جس حکومت کے ماتحت ہم زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس کی اطاعت ہم پر فرض ہے اور اس کے خلاف جہاد بالکل غلط ہے۔ لہٰذا انگریز کی امان میں رہ کر کوئی مسلمان انگریز کے خلاف جہاد نہیں کر سکتا۔

انگریز افسران نے اپنے طور پر خیال کیا کہ مسلمان بنیادی طور پر مذہبی نقطہ نگاہ سے عیسائیت کے خلاف ہیں اور شاہ نعمت اللہ ولی کی پیشین گوئی بھی ہے کہ ہندوستان پر ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں کا اقتدار ختم ہو جائے گا۔ اس لئے مسلمانوں نے اپنے عقائد کے اعتبار سے بغاوت شروع کی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ مسلمانوں نے نواب سراج الدولہ کا انتقام لیا ہے۔ اس لئے بغاوت میں شریک ہوئے ہیں۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ مسلمانوں کو مغلیہ سلطنت بیحد عزیز تھی اس کے چھن جانے سے انہیں صدمہ پہنچا ہے۔ جس کی وجہ سے بغاوت کو ہوا دی گئی ہے۔ حالانکہ یہ الزامات بے بنیاد تھے۔ جنگ آزادی کی صرف دو وجوہات تھیں۔ اوّل ہندوستان میں لیجسلیٹو پارلیمنٹ کا قیام اور اس میں کسی ہندوستانی کو شریک نہ کرنا۔

دوئم کارتوس کا معاملہ ان دو باتوں کے علاوہ کوئی تیسری بات بغاوت ہند کا براہِ راست باعث نہ تھی۔ باقی باتیں بغاوت دینے کا موجب ضرور ہوئیں۔

جب باغی گروہ میرٹھ سے دہلی پہنچا اور انگریزوں کا قتل عام شروع ہوا تو سرسیدؔ، مرزا غالبؔ۔ میر تراب علی، ڈپٹی رحمت خان۔ نواب شیفتہ اور اس کے دوستوں نے انگریز عورتوں اور بچوں کو زیادہ سے زیادہ مقدار میں اپنے گھروں میں چھپا لیا کہ باغیوں کے ہاتھوں ان کی جانیں بچ جائیں۔ ان کی جانیں بچانے میں فی الواقعہ ان خیر خواہ لوگوں کے گھروں، رشتہ داروں اور عزیز و اقارب کو لوٹ مار کر کے ختم کر دیا گیا۔ مگر ان خیر خواہوں نے پناہ گزینوں کو باغیوں کے سپرد نہ کیا۔ دشمن کا سارا عتاب اپنی جانوں پر لے لیا۔ انگریز نے اس کا صلہ یہ دیا کہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک تمام مسلمانوں کو بغیر کسی تمیز کے بغاوت ہند کی سازش کا مرتکب گردانا۔ اور صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ یہ آفت صرف مسلمانوں کی طرف سے لائی گئی ہے۔

انگریز انتقام پر اُتر آیا۔ محلے خالی ہو گئے۔ گھر تباہ کر دیئے گئے۔ شہر اُجڑ گئے۔ گلیاں سنسان نظر آنے لگیں۔ جو قتل و غارت سے بچ گئے وہ شہر چھوڑ کر بھاگ گئے۔ انگریز حکومت نے اپنی خیر خواہوں کو پہلے نشانہ بنایا۔ ان کے گھر لوٹے اُنہیں سزائیں دی گئیں

غالب بھی اس عتاب سے نہ بچ سکے۔ انہیں بھی پکڑ کر لے گئے۔ اتفاق سے رام کلی کو بھی اسی الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن بعد میں جب معاملہ کی تحقیق ہوئی اور مرزا صاحب کو بے گناہ پایا گیا تو انہیں چھوڑ دیا گیا۔ مرزا صاحب نے انگریز حاکم کے سامنے قسم کھا کر کہا کہ آپ کی حراست میں رام کلی نامی عورت بالکل بے گناہ ہے۔ بلکہ اس نے میرے اشارے پر انگریز بچوں کو اپنی حفاظت میں رکھا تھا۔ مرزا کے اس بیان پر رام کلی کو بھی رہا کر دیا گیا۔

رام کلی نے مرزا صاحب کا شکریہ ادا کیا اور حال پوچھا۔ مرزا صاحب نے کہا ؎

اک شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے
میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتمامی

★

مرزا اور رام کلی کشمیری دروازے سے باہر نکلے ہی تھے کہ ان کی نگاہ گورے سپاہیوں کی حراست میں چند لوگوں پر نظر پڑی۔ یہ سب کے سب ہندوستانی تھے۔ دیکھا کہ ان میں خورشید جان اور بلوان سنگھ بھی ہیں۔ انہیں دیکھ کر مرزا حیران رہ گئے۔ مرزا نے رام کلی سے کہا۔ وہ دیکھو گرفتار شدگان میں تمہاری سہیلی خورشید جان بھی ہے اور ہمارے بچپن کے دوست بلوان سنگھ بھی۔ رام کلی انہیں دیکھ کر تڑپ کر رہ گئی۔ مرزا کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ عرض کیا۔

خدا کے لئے انہیں بچالیں۔ انگریز افسر آپ کی بات مانتا ہے۔ مرزا نے کہا تم میرا یہیں انتظار کرو۔ میں صاحب سے مل کر آتا ہوں۔ مرزا صاحب تیز تیز قدم اٹھاتے پھر صاحب کے پاس پہنچے اور صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ بتایا کہ یہ لوگ آگرہ سے صرف میرے پاس مہمان آئے ہیں۔ وہاں کے فساد سے گھبرا کر جانیں بچا کر میرے پاس پناہ لینے آئے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ غالبؔ انگریزوں کا خیر خواہ ہے ملکہ وکٹوریہ کا مدّاح سرا ہے۔ اس خیال سے وہ دلّی آ گئے تھے۔ وہ بالکل بے گناہ ہیں۔ خورشید ایک بازاری عورت ہے بلوان سنگھ اس کا پُرانا آشنا ہے۔ ان عیش پرست لوگوں کو کسی کی عداوت یا محبت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ مرزا کی سفارش پر صاحب نے ان دونوں کی رہائی کا حکمنامہ لکھدیا۔ مرزا بھاگے بھاگے واپس پہنچے۔ اور انگریز سارجنٹ کو حکمنامہ دکھا کر انہیں رہا کروالیا۔ خورشید اور بلوان مرزا سے لپٹ کر زار زار روئے دل کا غبار ہلکا کیا اور سب مرزا کے ہاں چلے گئے ۔

★

مر گیا غالب آشفتہ نوا کہتے ہیں

انگریزی حکومت نے ملک کے اندرونی فسادات پر قابو پایا تو جذبۂ انتقام نے سر اٹھایا۔ آگرہ، میرٹھ، بجنور، کانپور اور دلی میں وہ حشر برپا ہوا کہ الاماں۔ کوچے کے کوچے مسمار کر دیئے گئے، محلوں کے محلے ڈھا دیئے گئے۔ گلیاں سنسان اور محلے ویران ہو گئے، شہروں کے نقشے بدل گئے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو چاروں طرف سے عتابِ حکمراں نے آن گھیرا۔ کچھ مارے گئے۔ کچھ پکڑے گئے۔ جو آن بلاؤں سے بچ گئے وہ شہر چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ ایک قیامتِ صغریٰ تھی کہ پھر ایسی بھیانک تصویر انسان کی آنکھ نے نہ دیکھی۔ ایسی تباہی مچی کہ دوست دشمن کی تمیز نہ رہی۔ وہ لوگ بھی اس عتاب کے جہنم میں ڈال دیئے گئے، جنہوں نے انگریز سے وفا کی تھی۔ انگریزوں کے بال بچوں کی حفاظت میں اپنے خاندانوں کو قربان کر دیا تھا۔ مرزا غالب بھی انہیں خیر خواہوں میں شامل تھے۔ اور وہ بھی اس عذاب سے محفوظ نہ رہ سکے۔ انگریز کو صرف مسلمان سے دشمنی تھی۔ عداوت تھی۔ بیر تھا۔ عناد تھا۔ اور

منفرت تھی۔ اس کا فیصلہ تھا کہ کسی سمت سے کسی قسم کی مشیت اُٹھی ہے اُسے اُٹھانے والا مسلمان ہے۔ صرف مسلمان بخواہ اس کے پس پردہ کسی رام چندر کا ہاتھ ہی کیوں نہ ہو۔ سر سید رحمۃ علیہ جیسے انگریزوں کے رفیق و مشفق نے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ اس بغاوت کو ہوا دینے والے مسلمان نہیں ہیں۔ بلکہ خود چند انگریز افسر ہیں یا ان کے غیر مسلم رفقاء غیر کار ہیں جن کی ناعاقبت اندیشی نے فسادات کا بیج بودیا ہے۔ لیکن انگریز کسی دلیل کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ اس نے صرف مسلمانوں کو بغاوت کا بانی تصور کر لیا تھا۔ اور مسلمان ہی سے اپنے خون کا بدلا لینا تھا۔ لیا۔ اور خوب لیا۔ مرزا اس وقت ساٹھ برس کے ضعیف کمزور اور ناتواں آدمی تھے۔ قویٰ مضمحل ہو چکے تھے۔ اس صدمہ جانکاہ سے زندہ لاش بن کر رہ گئے۔ وہ اپنے متعلق کہتے تھے ؎

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اِک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

شہر کی تباہی و بربادی کا ان الفاظ میں نقشہ کھینچا ہے ؎

زہرہ ہوتا ہے آب انسان کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرّہ ذرّہ خاک
تشنہ خوں ہے ہر مسلماں کا

کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک
آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ
سوزشِ داغہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم
ماجرا دیدۂ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے یارب کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

☆

ہجومِ غم نے غالب کو اس بُری طرح سے مار رکھا تھا کہ واقعی موت کو بدنام ہونے کی ضرورت نہ تھی۔ مرزا نے ملک الموت کو مخاطب کر کے کہا تھا؂

زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام
تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام

شب و روز کے مسلسل غمہائے ملک و ملت نے جینا دشوار کر رکھا تھا۔ ان غموں سے پل بھر کے لئے بے نیاز ہونے کے لئے مرزا شراب کا سہارا لیتے اور کہتے ہے

مئے ہی پھر کیوں نہ میں پیئے جاؤں
غم سے جب ہو گئی ہو زیست حرام

☆

کبھی اپنے محسن و مربّی سلطانِ ہند بہادر شاہ ظفر کے صدمے میں

لہو رو تے اور آتشِ غم سے بیتاب و بیقرار ہو کر کہتے ؎

ہاں اے نفسِ بادِ سحر شعلہ فشاں ہو
اے دجلۂ خوں چشمِ ملائک سے رواں ہو
اے زمزمۂ قُم لبِ عیسےٰ پہ فغاں ہو
اے ماتمیانِ شیعہ مظلوم کہاں ہو

مرزا پر غم و آلام کا اس درجہ اثر ہوا تھا کہ ہر سمت کے شور و غُل اور ہر طرف کی چیخ و پکار کو سمجھتے تھے۔ گویا خود ہی مصروفِ آہ و فغاں ہیں۔ ان واردات کی یوں تصویر کھینچی "

؎

اُٹھا اک دن بگولا سا جو میں کچھ جوشِ وحشت میں!
پھرا آسیمہ سر گھبرا گیا تھا جی بیاباں سے!
نظر آیا مجھے اِک طائرِ مجروح پر بستہ!
ٹپکتا تھا سرِ شوریدہ دیوارِ گلستاں سے
کہا میں نے کہ او ناکام آخر ماجرا کیا ہے
پڑا ہے کام تجھ کو کس ستمگر آفتِ جاں سے
ہنسا کچھ کھل کھلا کر پہلے پھر مجھ کو جو پہچانا
تو یوں رویا کہ جوئے خوں بہی پلکوں کے داماں سے
کہا میں صید ہوں اس کا کہ جس کے دامِ گیسو میں
پھنسا کرتے ہیں طائر روز آکر باغِ رضواں سے

اُسی کی زلف و رخ کا دھیان ہے شام و سحر مجھکو
نہ مطلب کفر سے ہے اور نہ ہے کچھ کام ایماں سے

بچشمِ غور جو دیکھا مرا ہی طائرِ دل تھا
کہ جل کر ہو گیا تھا خاک اپنی آہِ سوزاں سے

بعض اوقات شدتِ غم سے مرزا چیخ اُٹھتے اور کہتے ؎

سیاہی جیسے گر جاوے دمِ تحریر کاغذ پر
مری قسمت میں یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی

★

اسی زمانے میں عید الفطر آئی تو مرزا نے کہا ؎

ہوئی یہ کثرتِ غم سے تلف کیفیتِ شادی
کہ صبحِ عید مجھ کو بدتر از چاکِ گریباں ہے

★

مرزا صاحب کی جسمانی صحت بالکل تباہ و برباد ہو چکی تھی۔ اپنی اس حالتِ زار کے بارے میں کہا ؎

لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے
میرا ذمہ دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے

★

انگریز حاکموں نے شہر دہلی میں وہ تباہی مچائی کہ بیابان کا گمان ہونے لگا۔ ہر طرف خامشی و سناٹا۔ ہر سمت ہو کا عالم۔ در و دیوار

چپ چاپ ہے۔ غالب نے ان بستیوں پر ماتم کیا ہے ؎

ظلمت کدہ میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار اگر تمہیں ہوسِ ناؤ نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشہ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گلفروش ہے
یا صبحدم جو دیکھیے آکر تو بزم میں
نہ وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

★

صبح و شام دوستوں کی صحبت پر ماتم کرتے۔ شہر کی ویرانیوں پر سینہ کوٹتے اور پہروں سرنگوں ہو کر سوچتے۔ کہ کیا عالم تھا۔ اور کیا ہو گیا ہے ؎

ہجومِ غم سے یاں تک سرنگوں مجھکو حاصل ہے
کہ تارِ دامن و تارِ نظر میں فرق مشکل ہے

★

مرزا صاحب آگرہ سے اُٹھ آئے تھے۔ کہ غمِ عشق۔ غمِ جاں و جاناں

غمِ روزگار اور غمِ جہاں سے آسودگی حاصل ہو گی۔ دلی میں بھی سیاہ بختیوں نے پیچھا نہ چھوڑا۔ اور ہر لمحہ نت نئی آفت نے آن گھیرا اور مرزا نے کہا ؎

پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہے
سینہ جویائے زخمِ کاری ہے
وہی صدرنگ نالہ و فرسائی
وہی صد گونہ اشک باری ہے
پھر کیا پارہ جگر نے سوال
ایک فریاد و آہ و زاری ہے

بارہ برس کے عرصہ میں مرزا صاحب جن مشکلات سے دوچار رہے اور بر سرِ پیکار رہے گاہ گاہ ان کا تذکرہ کسی دوست کے خط میں کر دیتے یا طبیعت نے رنج اُگلا تو کوئی شعر کہہ دیا۔

وہ کونسی بلائے ناگہانی تھی۔ جو آسمان سے اُتری ہو اور اُس نے مرزا کا گھر نہ تاکا ہو۔ وہ کونسی بجلی تھی۔ جو مرزا کے نشیمن پر نہ گری ہو۔ ایسے ہی ماحول سے تنگ آکر مرزا نے یہ کہا تھا ؎

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

زمانے کی گردشِ پیہم کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے ؎

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

داغِ دل گر نظر نہیں آتا
بُو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

★

جب کوئی صورت نظر نہ آتی تو مالکِ کون و مکاں مختارِ دوجہاں کی بے نیازیوں اور غفلت شعاریوں پر طنز آمیز تبسّم سے زیرِ لب مسکرا کر کہہ اُٹھتے ہے

زندگی اپنی جو اس رنگ سے گزری غالبؔ!
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

★

اور پھر خود ہی زندگی کے آخری ایام پر نگاہ کر کے دل کو تسلّی دے لیتے اور کہتے ؎

سفینہ جب کہ کنارے پر آلگا غالب
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

★

جب اپنی حیاتِ مستعار کو عالمِ ناپائیدار میں چند روزہ مہمان پایا تو کہا ؎

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اُٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

★

اور پھر ایک آہ کھینچ کر کہا ؎

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد
آئے ہے بیکسیٔ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

★

سنہ ۱۸۶۹ء کا زمانہ تھا کہ کسی نے آکر خبر دی کہ چاوڑی بازار کی ایک حسینہ یوسف جمال جس کا نام رام کلی تھا۔ مر گئی ہے۔ غالب خود بستر علالت پہ پڑے تھے۔ اتنی سکت نہ تھی کہ اُٹھ کر چار قدم

چل سکتے جی جل کر رہ گیا۔ کہ اس سراپا وفا کا آخری دیدار بھی نصیب نہ ہوا۔"

جان تو مہمان تھی ہی۔ اس صدمے نے مرزا کو اور نڈھال کردیا۔ مرنے سے دو چار روز پہلے مرزا نے کہا ؎

کم نہیں نازشِ تمائیِ چشمِ خوباں
تیرا بیمار بُرا کیا ہے گر اچھا نہ ہوا

★

فروری کا مہینہ تھا۔ پیر کا دن تھا۔ (مطابق ۲، ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ) مرزا نے آہستہ سے کہا ؎

؎

درِ خورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

★

دوست احباب اور عزیز و اقارب مرزا کے پلنگ کے آس پاس بیٹھے تھے۔ گاہ گاہ شربتِ شیریں ان کے حلق میں ٹپکائے جاتے تھے کہ جناب شیفتہ نے آگے بڑھ کر طبیعت کا حال

پوچھا مرزا نے نہایت دھیمی آواز میں کہا ؎

؎

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید
مر گیا غالبؔ آشفتہ نوا کہتے ہیں

★

پھر کلمۂ شہادت پڑھا۔ ہاتھ درست کئے رُخ قبلہ رو کیا۔ ایک ہچکی لی اور سب کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں۔

ختم شد